آئینِ وہابیّت

استاد جعفر سُبحانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئینِ وہابیّت

تحریر:

استاد جعفر سبحانی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲-بے-۳/۶ ـــ ناظم آباد ـــ نمبر ۲ ـــ کراچی

فہرست

باب ۱۴

باب ۱۵

کتاب کا نام ______ آئین وہابیت
مؤلف ______ اُستاد جعفر سُبحانی
مترجم ______ مولانا مُنیر الحسن جعفری النجفی
ناشر ______ دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان
طبعِ اوّل ______ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ جنوری ۱۹۸۶ء
تعداد ______ دو ہزار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

وہابی مسلک کا بانی کون تھا؟

اگرچہ وہابی مسلک کا بانی "عبد الوہاب نجدی" کا بیٹا "شیخ محمد" ہے تاہم اس مسلک کو شیخ محمد کی بجائے اس کے والد "عبد الوہاب" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بعض علماء نے اس مسلک کو شیخ محمد کی بجائے اس کے والد کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اگر اسے شیخ محمد سے منسوب کر کے "محمدیہ" کا نام دیا جاتا تو اس صورت میں اس امر کا خدشہ موجود تھا کہ اس مسلک کے پیروکار اپنے مسلک کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک سے منسوب کر کے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

(مزید معلومات کے لئے دیکھئے دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ جلد ۱۰۔ ص ۸۷۱، المقتطف نامی رسالے کے حوالے سے جلد ۲۷۔ ص ۸۹۳)۔

شیخ محمد ۱۱۱۵ھ میں "نجد" کے ایک شہر "عیینہ" میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کے والد "قاضی" کے عہدے پر فائز تھے۔ بچپن سے ہی شیخ محمد کو تفسیر و احادیث اور مذہبی کتب کے مطالعے سے گہری دلچسپی تھی۔ موصوف نے "فقہ حنبلی" کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جن کا شمار فقہ حنبلی کے جید علماء میں ہوتا تھا۔ شیخ محمد نے جوانی کی منزل میں قدم رکھنے کے فوراً بعد "نجد" کے باشندوں کے اکثر مذہبی اعمال اور رسوم کو غلط قرار دینا شروع کر دیا۔ پھر جب وہ ایک بار فریضۂ حج کے بعد مدینۂ منورہ گیا اور وہاں اس نے قبر رسول ؐ پر مسلمانوں کو آنحضور ؐ کو وسیلہ قرار دے کر دعائیں کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کیا کیونکہ وہ اس عمل کو جائز خیال نہیں کرتا تھا۔

"نجد" واپسی کے بعد جب شیخ محمد نے "شام" کی طرف سفر کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ شام جانے سے قبل کچھ عرصہ "بصرہ" میں مقیم رہا جہاں اس نے لوگوں کے اکثر اعمال کو ہدفِ تنقید قرار دیا جس کی وجہ سے بصرہ کے عوام نے اسے اپنے شہر سے نکال دیا۔

جب اسے بصرہ سے نکال دیا گیا تو ابھی وہ "زبیر" نامی شہر اور بصرہ کے درمیان ہی تھا کہ گرمی اور پیاس کی شدت کے علاوہ پیدل چلنے کی وجہ سے اس کی حالت غیر ہونے لگی اور اگر اس موقع پر "زبیر" کے علاقے کا ایک شخص جس نے شیخ محمد کو علماء کے لباس میں دیکھنے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کی تھی اسے پانی نہ پلاتا اور اسے سواری پر بٹھا کر شہر نہ لے جاتا تو یقیناً راستے میں ہی شیخ محمد ہلاک ہو گیا ہوتا۔

شیخ محمد "زبیر" سے شام جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن زادِ سفر نہ ہونے کی بناء پر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور "احساء" نامی شہر روانہ ہو گیا جہاں پہنچنے کے بعد اس نے "نجد" کے ایک دوسرے شہر "حریملہ" کا قصد کیا۔ جس زمانے میں شیخ محمد "حریملہ" پہنچا اسی زمانہ میں یعنی ۱۱۳۹ھ میں اس کے والد "عبدالوہاب" بھی "عیینہ" سے حریملہ منتقل ہو گئے۔ اس طرح شیخ محمد ایک بار پھر اپنے والد کے ساتھ رہنے لگا۔ "حریملہ" میں قیام کے دوران شیخ محمد نے اپنے والد کی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا اور ایک بار پھر اس نے "اہلِ نجد" کے مذہبی عقائد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے نہ صرف شیخ محمد اور اس کے والد کے درمیان شدید

اختلافات پیدا ہو گئے بلکہ شیخ محمد اور اہلِ نجد ایک دوسرے کے سخت مخالف بن گئے۔ اختلافات اور جھگڑوں کا یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۳ھ میں اس کے والد عبدالوہاب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ (دیکھئے۔ تاریخ نجد آلوسی۔ ص ۱۱۱ سے ۱۱۳ تک)۔

شیخ محمد نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے خاص عقائد کے اظہار اور دوسرے لوگوں کے بعض مذہبی اعمال اور رسوم کی مذمت کا سلسلہ شروع کر دیا جسکی وجہ سے "حریملہ" کے کچھ لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور اس طرح شیخ محمد کو علاقے میں شہرت بھی حاصل ہونے لگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد شیخ محمد "حریملہ" سے "عیینہ" روانہ ہو گیا جہاں اس زمانہ میں "عثمان بن حمد" کی حکمرانی تھی۔ "عیینہ" پہنچنے پر "عثمان بن حمد" نے شیخ محمد کا خیر مقدم کیا اور اس کی عزت کی اور اس کی حمایت کرنے پر آمادہ ہوا اور اس کے جواب میں شیخ محمد نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تمام اہلِ نجد کو عثمان کی اطاعت کرنا چاہیئے۔ لیکن جونہی شیخ محمد نے اپنے عقائد کے پرچار کا سلسلہ شروع کیا اور "احساء" کے امیر کو اس کی سرگرمیوں کی خبر موصول ہوئی اس نے "عثمان بن حمد" کو خط لکھا جس کے نتیجہ میں عثمان نے شیخ کو اپنے پاس بلایا اور اس سے معذرت کی کہ وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ شیخ محمد نے عثمان بن حمد سے کہا کہ اگر وہ اس کی (شیخ کی) مدد جاری رکھے تو پورے نجد کا مالک ہو جائے گا۔ تاہم عثمان نے شیخ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اسے "عیینہ" کے شہر سے باہر نکال دیا۔

"عیینہ" سے نکالے جانے کے بعد شیخ محمد ۱۱۶۰ھ میں "نجد" کے مشہور و معروف شہر "درعیہ" کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت "درعیہ" کا امیر آلِ سعود کا جدِ اعلیٰ "محمد بن سعود" تھا جس نے شیخ محمد سے ملاقات کی اور اسے اپنے علاقے میں عزت و تکریم کے حصول کا مژدہ سنایا جس کے جواب میں شیخ نے بھی محمد بن سعود کو "نجد" کے تمام شہروں پر تسلط اور حکومت حاصل کرنے کی خوشخبری دی اور اس طرح شیخ محمد اور "آلِ سعود" کے درمیان تعلقات کا آغاز ہوا۔ (اگرچہ ایک عثمانی مصنف نے اپنی کتاب "تاریخ بغداد" کے صفحہ ۱۵۲ پر شیخ محمد اور آلِ سعود کے درمیان تعلقات استوار ہونے کے واقعہ کو دوسرے طریقے سے بیان کیا ہے تاہم جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے)

تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جب شیخ محمد "درعیہ" میں وارد ہوا اور اس نے "محمد بن سعود" کے ساتھ دوستی کی تو "درعیہ" کے عوام انتہائی "تنگدستی اور غربت کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

"تاریخ نجد" کے مصنف "آلوسی" نے "ابن بشر نجدی" کے حوالے سے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے (ابن بشر نے) جب پہلی بار "درعیہ" کا دورہ کیا تو اس وقت یہاں کے عوام کو بیحد تنگدستی اور غربت کے عالم میں زندگی بسر کرتے پایا تھا مگر دوسری بار جب میں نے "سعود" کے زمانہ میں اس علاقے کا دورہ کیا تو یہاں کے عوام کی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ اس علاقے کے لوگ بے پناہ دولت و ثروت کے مالک بن چکے تھے۔ ان کے ہتھیار سونے اور چاندی سے مزین تھے۔ وہ لوگ اصیل گھوڑوں پر سوار ہوتے۔ امیرانہ لباس زیب تن کرتے۔ یہاں کے عوام کی امیرانہ شان و شوکت اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ زبان اسکی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہے۔

موصوف مزید لکھتا ہے کہ:

ایک دن میں نے "درعیہ" کے بازار میں یہ منظر بھی دیکھا کہ مرد ایک قطار میں اور عورتیں دوسری قطار میں کھڑی ہیں اور بازار، سونا، چاندی، اسلحہ، اونٹ، بھیڑ، بکری، گھوڑے، زرق برق لباس گوشت گندم اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء سے بھرا پڑا ہے جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی بازار ہی بازار نظر آتے ہر طرف سے دوکانداروں اور خریداروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا میں نے فروخت کیا تو کوئی کہہ رہا تھا کہ میں نے خرید کیا۔

(تفصیلات کے لیے دیکھئے تاریخ ابن بشر نجدی)

"ابن بشر" نے اس امر کی وضاحت نہیں کی ہے کہ اس علاقے کے لوگوں کو آخر یہ بے پناہ دولت و ثروت کہاں سے حاصل ہوئی۔ لیکن تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اہل "نجد" نے دوسرے اسلامی شہروں اور مسلم قبائل پر حملوں کے ذریعے ان مسلمانوں کو لوٹنے کی وجہ سے حاصل کی تھی جو شیخ محمد کے عقائد کو قبول نہ کرنے کے "مجرم" تھے۔ شیخ محمد اپنے عقائد کو تسلیم نہ کرنے والے مسلمانوں پر نہ صرف حملہ کر کے ان کے مال و متاع کو لوٹنا جائز خیال کرتا تھا۔ بلکہ وہ ان مسلمانوں سے حاصل کردہ مال و متاع کو "مال غنیمت" سے تعبیر کرتا تھا اور اس مال

غنیمت کو استعمال کرنے کا مکمل اختیار صرف شیخ ہی کو حاصل تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس مال غنیمت کو صرف دریا میں افراد میں تقسیم کر دیتا اور اگر چاہتا تو اسے صرف اپنی ملکیت قرار دے دیتا۔ کیونکہ مال غنیمت شیخ کی ملکیت ہوتا تھا اس لئے امیر نجد کو بھی مال غنیمت میں سے کچھ حصہ اپنے لئے مخصوص کرنے کے لئے شیخ سے اجازت حاصل کرنا ہوتی تھی۔

شیخ محمد کی سرگرمیوں کا کمزور ترین پہلو یہی رہا ہے کہ وہ ان مسلمانوں کو جو اس کے غلط عقائد کو تسلیم نہیں کرتے تھے "جنگی کافر" قرار دے کر ان کے ساتھ جنگی کافروں جیسا سلوک روا رکھتا اور ان کی جان و ناموس کے لئے کسی قسم کی اہمیت و وقعت کا قائل نہ تھا۔

مختصر یہ کہ "محمد بن عبدالوہاب نجدی" لوگوں کو اپنی غلط توجیہات پر مبنی "توحید" کو قبول کرنے کی دعوت دیتا اور جو لوگ اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کے غلط عقائد کو تسلیم کر لیتے ان کا جان و مال محفوظ رہتا جبکہ اس کے برعکس وہ لوگ جو اسکی دعوت کو ٹھکرا دیتے انہیں "جنگی کافروں" کے زمرے میں شامل کر دیا جاتا اور ان کی جان لینا اور مال لوٹنا حلال و مباح سمجھا جاتا تھا۔

وہابی مسلک کے پیروکاروں نے "نجد" کے اندر یا نجد سے باہر یمن، حجاز، شام (سوریہ) اور عراق وغیرہ میں جو جنگیں لڑی تھیں ان تمام جنگوں کی اصل وجہ ان علاقوں کے مسلمانوں کی طرف سے شیخ محمد کے غلط عقائد کو قبول کرنے کی دعوت ٹھکرا دینا ہی تھا۔ وہابیوں کے نزدیک ہر وہ شہر جس پر وہ جنگ کے ذریعے قبضہ حاصل کر لیتے ان کے لئے "حلال" کا حکم رکھتا تھا اسی لئے اس قسم کے شہروں کو اپنی ملکیت اور جاگیر قرار دینا اگر ان کے لیے ممکن ہوتا تو وہ انہیں اپنی جاگیر قرار دے دیتے ورنہ ان شہروں سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت پر ہی اکتفا کرتے تھے (دیکھئے کتاب جزیرة العرب فی القرن العشرین۔ ص ۳۴۱)

تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ جو وہابیوں کے عقائد کو مان لیتے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ شیخ محمد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ جبکہ اس کے برعکس وہ لوگ جو شیخ کی دعوت کو ٹھکرا دیتے اور اس کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے کھڑے ہوتے انہیں قتل کرا دیا جاتا اور ان کے مال و متاع کو اپنے پیروکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا اور یہی وہ روش

تھی جس پر چلتے ہوئے "احساء" کے نواحی علاقوں میں واقع ایک گاؤں میں جس کا نام "فصول" بتایا جاتا ہے تقریباً تین سو افراد کا قتل عام کیا گیا اور ان کے مال و متاع کو لوٹ لیا گیا تھا۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے تاریخ المملکۃ العربیہ السعودیہ ج ۱ - ص ۵۱ -)

۱۲۰۶ ھ میں جب شیخ محمد بن عبدالوہاب اس دنیا سے رخصت ہوگیا (یاد رہے کہ شیخ کی تاریخ پیدائش اور موت کے بارے میں ۱۱۱۵ - ۱۲۰۶ ھ کے علاوہ دیگر اقوال بھی پائے جاتے ہیں) تو اس کے پیروکاروں نے شیخ کے مشن کو جاری رکھا مثال کے طور پر ۱۲۱۶ ھ میں وہابی العقیدہ امیر سعود نے ۲۰ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر تیار کرنے کے بعد کربلائے معلیٰ کی سرزمین پر حملہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کربلائے معلیٰ اپنی شہرت و عظمت کے عروج پر تھا اور ایران، ترکی اور عرب ممالک کے زائرین کا کربلائے معلیٰ میں تانتا بندھا رہتا تھا۔ امیر سعود کربلائے معلیٰ کا محاصرہ کرنے کے بعد جب شہر میں وارد ہوا تو اس نے اس مقدس سرزمین کے باشندوں اور اس شہر کا دفاع کرنے والوں کا وحشیانہ انداز سے قتل عام کیا۔

وہابیوں کے اس لشکر نے کربلائے معلیٰ کے شہر میں جو تباہی و بربادی مچائی تھی اسے الفاظ کے ذریعے بیان کرنا ناممکن ہے۔ امیر سعود کے لشکر میں شامل وہابیوں نے اس مقدس شہر میں پانچ ہزار (جبکہ بعض مورخین کے مطابق بیس ہزار) افراد کے وحشیانہ قتل عام کے بعد امام حسین علیہ السلام کے حرم مطہر میں موجود خزانوں کا رخ کیا۔ یہ خزانے نہایت گراں بہا اور نفیس ترین اشیاء کے علاوہ مال و دولت سے بھرے پڑے تھے "سعود" نے وہاں کی ہر چیز کو لوٹ لیا اور امام حسین علیہ السلام کے حرم مطہر کے خزانوں میں موجود مال و دولت اپنے قبضے میں لے لی۔ تاریخ کربلا کا یہ وہ دلخراش سانحہ ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد امام عالی مقام (ع) سے عقیدت رکھنے والے شعراء نے اس سانحہ کے بارے میں مرثیے لکھے (دیکھئے تاریخ کربلا و حائر حسین - ص ۱۷۲ - ۱۷۴) مورخین کے مشہور اقوال سے پتا چلتا ہے وہابی العقیدہ افراد مسلسل بارہ برس تک کربلائے معلیٰ، اس کے نواحی علاقوں اور نجف اشرف کی مقدس سرزمین پر حملہ آور ہوتے رہے ان حملوں کا آغاز ۱۲۱۶ ھ سے ہوا۔ اور مذکورہ بالا حملہ جو کربلائے معلیٰ پر کیا گیا اس کے بارے میں شیعہ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ حملہ اسی سال "عید غدیر" کے دن (۱۸ ذی الحجہ) کیا گیا تھا۔

علامہ سید محمد جواد عاملی (مرحوم) اپنی قابل قدر فقہی کتاب مفتاح الکرامۃ کی ساتویں جلد کے آخر میں اسی سانحہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

زیر نظر کتاب کا یہ حصہ ۹ رمضان المبارک ۱۲۲۵ ھ کو نصف شب کے وقت مصنف کے ہاتھوں ایک ایسی حالت میں تکمیل کے مراحل تک پہنچا ہے جبکہ مصنف کا دل اور دماغ بے حد تشویش اور اضطراب کی کیفیت سے دوچار تھے کیونکہ "عنیزہ" کے وہ عرب باشندے جو "وہابی العقیدہ" ہیں انہوں نے نجف اشرف کے اطراف اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے روضۂ مبارک کا محاصرہ کر کے تمام راستے بند کر دیئے کے بعد نیمۂ شعبان کے موقع پر زیارت قبر امام حسین علیہ السلام کے لئے آنے والے زائرین کو ان کی وطن واپسی سے قبل لوٹنے کے علاوہ ان زائرین کی ایک بہت بڑی تعداد کا جن میں زیادہ تر ایرانی شامل تھے قتل عام کیا ہے اگرچہ اس بار قتل ہونے والے زائرین کی تعداد ۱۵۰ افراد بتائی گئی ہے تاہم اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ قتل ہونے والوں کی تعداد مذکورہ تعداد سے کم ہے۔

(مفتاح الکرامۃ ج ۷ ص ۶۵۳)

بہرحال وہ "عقیدۂ توحید" جسے قبول کرنے کی شیخ محمد اور اس کے پیروکار دعوت دیتے تھے اگر اس دعوت کو کوئی قبول کرنے سے انکار کر دیتا تو پھر انکار کرنے والے کی جان مال اور ناموس وہابیوں کے لئے حلال اور مباح ہو جاتے یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہابی جس عقیدہ توحید کو قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہ عقیدہ چند آیات و احادیث کے ظاہری معنیٰ کے ذریعے ذات باری تعالیٰ کے لئے جہت اور سمت کے اثبات اور اللہ تعالیٰ کو اعضاء و جسم رکھنے والی شے تصور کرنے پر مبنی ہے۔

"آلوسی" کا کہنا ہے کہ "وہابی طبقہ" ابن تیمیہ کی پیروی میں ان احادیث کی تائید کرتے ہیں جن کے ذریعے "ابن تیمیہ" نے خداوند عزّ و جل کی آسمان دنیا (آسمان اوّل) پہ آمد کو ثابت کیا ہے اور اس ضمن میں خیال ظاہر کیا ہے کہ یہی وہ موقع ہے جب خداوند عزّ و جل عرش سے دنیا کے آسمان پر آنے کے بعد سوال کرتا ہے کہ:

هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ (یعنی کیا کوئی توبہ کرنے والا ایسا ہے جو اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار ہو؟) اس کے علاوہ موصوف (آلوسی) ہی کا کہنا ہے کہ "وہابی" ان [illegible]

ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن خداوندِ عالم میدانِ محشر میں آئے گا۔ (اپنے جسم کے ساتھ) اور اس حقیقت کو خدا نے قرآن حکیم میں یوں بیان فرمایا ہے کہ:

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (سورۂ فجر۔ آیت ۲۳)

نیز ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خداوند عزّوجل اپنی ہر مخلوق سے جس طرح چاہے گا نزدیک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خود خداوندِ عالم کا ارشاد ہے کہ:

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (سورۂ ق۔ آیت ۱۵)

(مزید تفصیلات جاننے کے لئے مطالعہ فرمائیں (تاریخ نجد از آلوسی ص ۱۹۰-۱۹۱ اور "ابن تیمیہ" کا رسالہ العقیدہ الحمویۃ)

قابلِ ذکر ہے یہ امر کہ "ابن تیمیہ" نے جیسا کہ اس کی کتاب "الرّدعلی الاخنائی" کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے (قبر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی زیارت سے متعلق احادیث کو جعلی احادیث قرار دے کر اس ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی اس امر پر اعتقاد رکھتا ہے کہ وفات کے بعد بھی آنحضور (ص) کا وجود آپ صلعم کی حیاتِ مبارکہ کی مانند ہے تو اس قسم کا عقیدہ رکھنے والا شدید غلط فہمی کا شکار ہے جبکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے بھی اس مسئلے کے بارے میں "ابن تیمیہ" کے خیالات سے مشابہ عقیدے کا اپنے زمانہ میں شدت کے ساتھ اظہار کیا۔ چنانچہ وہابیوں کے غلط عقائد اور اقوال کے بارے میں یہ کہنا قطعی بجا معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ غلط عقائد اور اقوال ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام کے بارے میں مذکورہ غلط عقائد کی روشنی میں تحقیق کرنے والوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام ایک بے حد خشک اور جامد قسم کا دین ہے۔ اسی لئے یہ دین ہر زمانے کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

"لوٹرپ سیٹوورڈ" کا قول ہے کہ:

کیونکہ وہابی "تعصّب کے معاملہ میں انتہا پسند واقع ہوئے ہیں اسی لئے وہ گروہ یا طبقہ جس پر "بال کی کھال اتارنے" کا محاورہ صادق آتا ہے اس نے وہابیوں کے مخصوص طور طریقوں کو دلیل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

اسلام کی حقیقت اور فطرت نہ تو ہر زمانے میں انسانی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے اور نہ ہی

معاشرے کی ترقی اور تبدیلیوں میں مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کسی صورت میں بھی زمانے کے تغیرات سے سازگار نہیں ہو سکتا۔

دیکھیے کتاب دنیائے اسلام کی موجودہ صورتحال (حاضر العالم الاسلامی) ج ۱ ص ۲۶۴)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جس زمانے میں اپنے عقائد کے اظہار کا سلسلہ شروع کیا تھا اسی زمانہ سے ہی اسلام کے مایہ ناز علمائے موصوف کے عقائد کی مخالفت میں اپنے خیالات کے اظہار کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ افراد جنہوں نے سب سے پہلے شیخ محمد کے غلط عقائد کی مخالفت کی ان میں شیخ محمد کے والد عبدالوہاب اور ان کے بعد شیخ محمد کا بھائی شیخ سلیمان بن عبدالوہاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان دونوں کا تعلق فقہ حنبلی کے گراں قدر علماء میں ہوتا ہے۔

شیخ سلیمان بن عبدالوہاب نے "الصواعق الالٰهية في الرد على الوهابية" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس میں موصوف نے اپنے بھائی (شیخ محمد) کے عقائد کو رد کیا تھا۔

"الفتوحات الاسلامية" نامی کتاب میں "زینی دحلان" لکھتا ہے کہ:

شیخ محمد کے والد عبدالوہاب ایک صالح اور اہل علم انسان تھے اسی طرح شیخ محمد کے بھائی شیخ سلیمان کا شمار بھی اہلِ علم شخصیات میں ہوتا تھا۔ شیخ محمد کے والد اور اس کا بھائی شیخ سلیمان اسی زمانہ سے ہی شیخ کے غلط اندازِ فکر کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ جبکہ شیخ طالب علمی کے دور سے گذر رہا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دونوں شیخ کو ڈانٹنے پھٹکارنے کے علاوہ عوام کو شیخ سے دور رکھنے کی بھرپور سعی کرتے رہے تھے۔

(دیکھئے مذکورہ کتاب کی ج ۲ - ص ۳۵۷)

"الاسلام فی القرن العشرین" میں عباس محمود عقاد نے لکھا ہے کہ:

شیخ محمد کے مخالفین میں اس کے سب سے بڑے مخالف "الصواعق الالٰهية في الرد على الوهابية" کے مؤلف یعنی شیخ کے بڑے بھائی شیخ سلیمان تھے عقاد نے اسی ضمن میں مزید لکھا ہے کہ شیخ سلیمان جنہیں شیخ محمد کا سب سے بڑا مخالف کہا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے بھائی کے غلط عقائد کو شدت سے رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

وہ امور جنہیں "وہابی العقیدہ" افراد شرک اور کفر سے تعبیر کرتے ہیں نیز ان امور کو مسلمانوں کی جان و مال پر تصرف اور نقصان پہنچانے کی دلیل قرار دیتے ہیں ۔ آئمۂ اسلام کے زمانے میں بھی موجود تھے مگر کسی بھی آئمۂ اسلام کے حوالے سے ایسی کوئی روایت نہیں مل سکی جس کے پیش نظر ان رسوم کو بجا لانے والے افراد کو کافر یا مرتد کہا یا سمجھا گیا ہو اور ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہو یا پھر یہ کہ اسلامی شہروں کو وہابیوں کی طرح "بلادِ شرک اور دار الکفر" کہا گیا ہو (مزید تفصیلات جاننے کے لئے مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۲٦ تا ۱۲۷ کا مطالعہ فرمائیں)

بہر حال یہاں تک سلسلۂ گفتگو پہنچا دینے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ضمن میں اس امر کی یاد دہانی کراتے جائیں کہ "شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی" کو مسلکِ وہابیت کے موجد یا بانی کے نام سے تسلیم کرنا درست نہیں کیونکہ شیخ محمد کے معرضِ وجود میں آنے سے صدیوں قبل وہابیت کے آئینہ دار افکار و عقائد مختلف شکلوں میں موجود تھے اور انہیں "ابن تیمیہ" جیسے افراد ظاہر کرتے رہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ماضی میں یہ عقائد ایک نئے مذہب کی شکل و صورت اختیار نہیں کر سکے جس کی اہم ترین وجہ اس زمانے میں اس قسم کے عقائد رکھنے والوں کی تعداد بے حد کم ہونا تھی ۔

"ابو العباس احمد بن عبد الحلیم" جو "ابن تیمیہ" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تاریخِ وفات ۷۲۸ ھ بتائی جاتی ہے ۔ اگرچہ اس کا تعلق فقہ حنبلی کے علماء میں ہوتا ہے تاہم جب "ابن تیمیہ" نے دیگر تمام اسلامی فرقوں کے اعتقادات کے منافی غلط عقائد کا اظہار کیا تو دیگر اسلامی فرقوں کے علماء نے ہمیشہ اس کی شدید مخالفت کی اور محققین کی رائے کے مطابق "ابن تیمیہ" کے غلط عقائد ہی بعد میں "وہابی اعتقادات" کی بنیاد قرار پائے ۔

باب ۲

اولیائے خدا کی قبور کی تعمیر اور وہابیت

وہ اہم مسائل جن کے بارے میں "وہابیوں" نے اپنے عقائد کا خاص طور پر شدت کے ساتھ اظہار کیا اور بہت اہمیت دی ہے ان میں ایک مسئلہ قبور کی تعمیر اور انبیائے خدا کی قبور پر عمارتوں اور گنبد وغیرہ کا تعمیر کرنا ہے ۔

مذکورہ مسئلہ پر سب سے پہلے "ابن تیمیہ" اور اس کے مشہور شاگرد "ابن القیم" نے اظہارِ خیال کیا اور قبروں پر گنبد وغیرہ کی تعمیر کو امرِ حرام قرار دیکر انہیں مسمار کرنے کا فتویٰ صادر کیا تھا ۔

"ابن القیم" اپنی کتاب زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ۔ کے صفحہ ٦٦۱ پر مذکورہ مسئلے کے بارے میں لکھتا ہے کہ ؛ (درجِ ذیل حدیث کشف الارتیاب کے صفحہ ۳۵۸ پر بھی مذکور ہے ۔)

يَجِبُ هَدْمُ الْمَشَاهِدِ الَّتِي بُنِيَتْ عَلَى الْقُبُوْرِ، وَلَا يَجُوْزُ إِبْقَاءُهَا بَعْدَ الْقُدْرَةِ عَلَى هَدْمِهَا وَإِبْطَالِهَا يَوْمًا وَاحِدًا۔

وہ عمارت یا گنبد جو قبر پر بنایا گیا ہے اس کا مسمار کرنا واجب ہے اور جب اس قسم کی عمارت کو مسمار کرنے کی (کسی شخص میں) قدرت و طاقت موجود ہو تو پھر اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایک دن کے لئے بھی (اس قسم کی عمارتوں کو) باقی رہنے دے۔

۱۳۴۴ ھ میں جب آل سعود نے مکۂ مکرمہ، مدینۂ منورہ اور ان کے نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے بقیع میں خاندانِ رسالت اور اصحابِ رسولِ خدا (ص) کے روضوں اور مقابر کو مسمار کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا بہانہ تراش سکیں جس کے سہارے وہ مدینۂ منورہ کے علمائے کرام سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد ان عتباتِ مقدسہ کو مسمار کرنے کی راہ ہموار کر سکیں یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آل سعود کو اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کیونکہ حجاز کے عوام قبور کو مسمار کرنے کے عمل کی کسی صورت میں حمایت کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ بہانہ تلاش کرنے والوں نے آخر کار بہانہ تلاش ہی کر لیا جس کے پیشِ نظر "نجد" کے "قاضی القضاۃ" "سلیمان بن بلیہد" کو مدینۂ منورہ کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ وہ وہاں کے علمائے وہابیوں کو درپیش مشکل کے بارے میں گفت و شنید کرے۔ سلیمان بن بلیہد نے وہابیوں کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے ہم عقیدہ افراد کی طرف سے چند سوالات کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ ان سوالات کے جوابات وہابیوں کے عقیدے کے مطابق سوالات میں ہی پوشیدہ تھے پھر ان سوالات کو وہاں (مدینۂ منورہ) کے مفتیوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ (مفتی حضرات) ان سوالات کے بارے میں وہی فتویٰ صادر کریں جنہیں سوالات میں ہی بیان کیا گیا ہے اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان پر "شرک" کا حکم جاری کر کے ان کی مذمت کی جائے گی اور اس حکم کے بعد بھی اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو انہیں واجب القتل قرار دے دیا جائے گا۔

مذکورہ بالا سوالات و جوابات مکۂ مکرمہ سے شائع ہونے والے ام القریٰ نامی

رسالے کے ماہ شوال ۱۳۴۴ ھ کے شمارے میں شائع ہوئے تھے اور ان کی اشاعت کے فوراً بعد ہی تمام اسلامی فرقوں خصوصاً اہلِ تشیع اور اہلِ تسنن کے درمیان ایک کہرام مچ گیا۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ مذکورہ سوالات کے بارے میں اگرچہ رعب اور دھمکیوں کے ذریعے فتاویٰ حاصل کئے گئے ہیں تاہم ان فتاویٰ کے حصول کے بعد اسلام کے پیشواؤں کی قبور مسمار کرنے کے کام کو یقیناً انجام دے دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ آقائے بزرگ تہرانی مرحوم نے اپنی کتاب "الذریعہ" کی جلد۔ ۸ صفحہ ۲۶۱ پر تحریر فرمایا ہے کہ وہابیوں نے ۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ ھ کو حجاز پر قبضہ کیا تھا اور ۸۔ شوال ۱۳۴۳ ھ کو جنت البقیع میں مدفون ائمہ اور صحابہ کرام کی قبور کو مسمار کیا تھا) جبکہ "ام القریٰ" نامی رسالے میں سوالات و جوابات ۱۷ شوال ۱۳۴۴ ھ کے شمارہ میں شائع ہوئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ علما نے مذکورہ سوالات کے جوابات ۲۵ رمضان المبارک کو دیئے تھے یعنی "ام القریٰ" کے مطابق حجاز پر قبضے اور قبورِ بقیع کو مسمار کرنے کا واقعہ دونوں باتیں ۱۳۴۴ ھ سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ سید محسن امین مرحوم نے بھی حجاز پر قبضے اور قبورِ بقیع کو مسمار کرنے کی تاریخ ۱۳۴۴ ھ ہی بیان کی ہے دیکھئے "کشف الارتیاب ص ۵۶ تا ۶۰)

تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مدینۂ منورہ کے ۱۵ علما سے فتاویٰ حاصل کرنے اور حجاز میں ان فتاویٰ کے شائع ہونے کے بعد اسی سال (۱۳۴۴ ھ) کے ماہ شوال کی ۸ تاریخ سے ہی خاندانِ رسالت کے آثار کو مسمار کرنے کا شرمناک کام شروع کر دیا گیا۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام اور جنت البقیع میں مدفون اصحابِ رسول (ص) کی قبور کو مسمار کرنے کے علاوہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے روضہ ہائے مبارکہ کے قیمتی ساز و سامان کو بھی لوٹ لیا گیا۔ جنت البقیع کو ایسے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا جسے دیکھ کر انسان کا دل کانپنے لگتا ہے۔

یہاں تک سلسلۂ کلام پہنچانے کے بعد ضروری ہے کہ مذکورہ بالا سوالات میں سے کم از کم ایک سوال کے کچھ حصے کو بیان کر دیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ سوال تیار کرنے والوں نے کس طرح سوالات میں ہی جوابات پوشیدہ رکھے تھے اگر ان سوالات کا دقت کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ان سوالات کو پیش کرنے والے

درحقیقت سوال نہیں کر رہے تھے بلکہ آثارِ رسالت کو مٹانے کے علاوہ عوام الناس کو یہ تاثر دینے کے لئے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق قبور کو مسمار کیا ہے، بہانہ تلاش کر رہے تھے اس لئے کہ اگر سوال کرنے والوں کا مقصد مسائل کے بارے میں علم حاصل کرنا ہوتا تو پھر اس امر کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ سوال کرنے والا اپنی خواہش کے مطابق سوالات میں ہی جوابات بھی ذکر کرے۔ لہٰذا جس انداز سے جوابات کو سوالات ہی میں ظاہر کیا گیا اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ سوالات اور ان کے جوابات پہلے سے ہی تیار کر لئے گئے تھے اور صرف علماء کے دستخطوں کو حاصل کرنے کے لئے ان سوالات کو علماء کے پاس بھیجا گیا تھا ورنہ یہ بات حقیقت سے دور نظر آتی ہے کہ مدینہ منورہ کے مقتدر علماء اور ان کے بزرگ جو مدتوں سے آثارِ نبوی کے محافظ اور نگہبان تھے اچانک ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہو گئی اور انہوں نے قبروں پر عمارتیں بنانے کو حرام اور ان عمارتوں یا گنبدوں کو مسمار کرنے کے بارے میں فتویٰ صادر کر دیا۔

سلیمان بن بلیہد کے سوال کا متن درج ذیل تھا۔

مَا قَوْلُ عُلَمَاءِ الْمَدِيْنَةِ الْمُنَوَّرَةِ زَادَهُمُ اللّٰهُ فَهْمًا وَعِلْمًا فِي الْبِنَاءِ عَلَى الْقُبُوْرِ وَاتِّخَاذِهَا مَسَاجِدَ۔ هَلْ هُوَ جَائِزٌ اَوْ لَا؟ وَاِذَا كَانَ غَيْرَ جَائِزٍ بَلْ مَمْنُوْعٌ مَنْهِيٌّ عَنْهُ نَهْيًا شَدِيْدًا فَهَلْ يَجِبُ هَدْمُهَا وَمَنْعُ الصَّلَاةِ عِنْدَهَا اَمْ لَا؟ وَاِذَا كَانَ الْبِنَاءُ فِيْ مُسَبَّلَةٍ كَالْبَقِيْعِ وَهُوَ مَانِعٌ مِنَ الْاِنْتِفَاعِ بِالْمِقْدَارِ الْمَبْنِيِّ عَلَيْهِ فَهَلْ هُوَ غَصْبٌ يَجِبُ رَفْعُهُ لِمَا فِيْهِ مِنْ ظُلْمِ الْمُسْتَحِقِّيْنَ وَمَنْعِهِمْ اِسْتِحْقَاقَهُمْ اَمْ لَا؟

ترجمہ

کیا فرماتے ہیں علمائے مدینہ منورہ۔ خدا ان کی عقل اور فہم میں اضافہ فرمائے۔ قبروں پر عمارت یا گنبد بنانے اور انہیں مساجد قرار دینے کے بارے میں کیا ایسا کرنا جائز

ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز نہیں ہے بلکہ اسلام میں سختی سے اسے ممنوع (ناجائز) قرار دیا گیا ہے تو کیا ان کو مسمار کرنے اور ان کے پاس نماز پڑھنے سے روکنا ضروری اور واجب ہے یا نہیں؟ نیز بقیع کی مانند ایک زمین جہاں قبروں پر گنبد اور عمارت کے موجود ہونے کی وجہ سے اس کے کچھ حصوں کو جن پر عمارتیں واقع ہیں استعمال نہیں کیا جا سکتا وہاں یہ کام (گنبد اور عمارت بنانا) وقف زمین کے ایک حصے پر ناجائز قبضہ کرنے کے مترادف نہیں ہے اگر ہے تو کیا ضروری نہیں ہے کہ اسے جلد از جلد ختم کیا جائے تاکہ مستحق پر جو ظلم ہوا ہے اسے ختم کیا جا سکے؟

مدینہ منورہ کے وہ علماء جنہیں دھمکیوں سے مرعوب کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے شیخ کے سوال کا جو جواب دیا اس کا متن درج ذیل ہے۔

اَمَّا الْبِنَاءُ عَلَى الْقُبُوْرِ فَهُوَ مَمْنُوْعٌ اِجْمَاعًا لِصِحَّةِ الْاَحَادِيْثِ الْوَارِدَةِ فِيْ مَنْعِهِ وَلِهٰذَا اَفْتٰى كَثِيْرٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ بِوُجُوْبِ هَدْمِهِ مُسْتَنِدِيْنَ بِحَدِيْثٍ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّهُ قَالَ: لِاَبِي الْهَيَّاجِ۔ اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِيْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص)، اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّيْتَهُ۔

ترجمہ

قبور پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا متفقہ طور پر ممنوع (ناجائز) عمل ہے ان احادیث کی روشنی میں جو قبور پر عمارت تعمیر کرنے سے باز رکھنے سے متعلق ہیں اور انہی احادیث کے پیش نظر ہی اکثر علمائے قبور پر تعمیر شدہ عمارتوں اور گنبدوں کو مسمار کرنے کے بارے میں فتویٰ صادر کیا ہے اکثر علمائے اس ضمن میں اس حدیث کو بطور سند پیش کیا ہے جس میں حضرت علی (علیہ السلام) نے ابی الہیاج سے فرمایا تھا کہ:

یں تجھے وہی کام سونپ رہا ہوں جو مجھے جناب رسول اکرم (ص) نے سونپا تھا (اے ابی الهیاج) تو نہیں دیکھے گا کسی تصویر کو مگر یہ کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کردے اور تو کسی قبر کا مشاہدہ نہیں کرے گا، لیکن یہ کہ اس کو مساوی اور برابر نہ کردے۔

شیخ نجدی نے ۱۳۴۳ھ کے ماہ جمادی الثانی میں شائع ہونے والے "ام القریٰ" کے شمارہ میں اپنے ایک مقالہ میں قبور پر گنبد اور عمارتوں کی تعمیر کے آغاز پر گفتگو کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ قبور پر گنبد اور عمارت بنانے کا عمل پانچویں ہجری سے چلا آرہا ہے۔

بہر حال یہ ہیں "وہابیوں" کے وہ اقوال جو قبور پر گنبد اور عمارت بنانے سے متعلق ہیں اور انہی اقوال میں وہابیوں نے ثبوت کے طور پر دو دلائل پیش کئے ہیں۔

۱۔ علمائے اسلام نے قبور کی تعمیر کو ممنوع یعنی ناجائز قرار دینے پر اتفاق کیا ہے۔

۲۔ جناب امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب (ع) کے حوالے سے ابی الهیاج کی حدیث اور اسی طرح کی دیگر احادیث۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ ہمارا موضوعِ گفتگو قبور کی تعمیر ان قبور پر عمارت بنانا یا گنبد کی تعمیر ہے جبکہ قبور کی زیارت ایک علیحدہ موضوع ہے جس کے بارے میں ہم آگے چل کر علیحدہ تفصیلی بحث کریں گے۔ لہٰذا ہم اپنے موضوعِ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے درج ذیل تین امور پر بحث و گفتگو پیش کریں گے۔

۱۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کا نظریہ کیا ہے، کیا قرآن حکیم سے قبور کی تعمیر کے جواز کے لئے کوئی حکم اخذ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ کیا یہ درست ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے تمام علماء قبور کی تعمیر کو ناجائز خیال کرتے ہیں، یا اس کے برعکس اسلام کے مختلف ادوار میں موجودہ روش کے برعکس عمل ہوتا چلا آیا ہے اور جناب رسول اکرم (ص) کے علاوہ ان کے اصحاب کے زمانہ میں قبور کی تعمیر اور ان پہ عمارت یا گنبد بنانا معمول تھا یا نہیں؟

۳۔ ابی الهیاج کی حدیث یا اسی قسم کی دیگر احادیث جنہیں وہابی طبقہ قبور کی تعمیر کے ناجائز ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے اس کا اصل مفہوم کیا ہے؟

الف۔ تعمیر قبور کے بارے میں قرآن کا حکم یا نظریہ

اگرچہ قرآن حکیم میں قبور کی تعمیر کے بارے میں وضاحت کے ساتھ کوئی حکم نہیں ہے تاہم اس مسئلے سے متعلق قرآن مجید میں جو کلیات بیان کئے گئے ہیں ان کے ذریعے اس سلسلے میں حکم اخذ کیا جاسکتا ہے اور اس مسئلے سے متعلق چند کلیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن مجید میں شعائر الٰہیہ کی تعظیم کو قلوب کے تقویٰ کی علامت اور دلوں کی پرہیزگاری قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ (سورۃ حج۔ آیت ۳۲)

ترجمہ

اور جو اللہ کے شعائر کا احترام کرے تو یہ (احترام) قلوب کے تقویٰ کی علامت ہے۔ قابل غور و فکر ہے یہ امر کہ اس آیہ میں "شعائر الٰہیہ" کے احترام سے کیا مراد ہے؛ شعائر کا لفظ "شعیرہ" کی جمع ہے جس کے معنیٰ علامت اور نشانی کے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں جن علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد وہ آیتیں نہیں ہیں جو خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اس لئے کہ تمام کائنات اس کے وجود کا ثبوت ہے پھر کسی (مفسر) نے یہ نہیں کہا کہ آیت میں ہر اس چیز کے احترام کا ذکر ہے جو وجود خدا پر دلالت کرتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہر اس چیز کا احترام جو وجودِ خدا کو ثابت کرے قلوب کے تقویٰ کی دلیل ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ وہ نشانیاں جن کا احترام قلوب کے تقویٰ کی دلیل ہے وہ علامتیں وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کے دین سے ہے چنانچہ مذکورہ آیہ کے مفسرین نے کہا ہے کہ "معالم دین اللہ" یعنی دین خدا کی علامتیں۔

(دیکھئے مجمع البحرین۔ ج۔ ۳۔ ص ۸۳ مطبوعہ صیدا۔ لبنان)

اس ضمن میں بطور دلیل کہا جاتا ہے کہ اگر قرآن حکیم میں صفا و مروہ (دیکھئے سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ) یا پھر اس اونٹ کو جسے قربانی کے لئے منیٰ لے جایا جاتا ہے (سورہ حج۔ آیت ۳۶ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ

شَعَائِرَ اللّٰہِ ...) کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں دینِ حنیف اور آئینِ ابراہیمی کی علامات ہیں۔ اسی طرح اگر "مزدلفہ" کو "مشعر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہے اور اس میں "وقوف" دین پر عمل پیرا ہونے اور خدا کے اطاعت گذار ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ تمام مناسکِ حج کو اگر "شعائر اللہ" کا نام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی بتائی گئی ہے کہ سب دینِ توحید اور دینِ حنیف سے تعلق رکھنے والے اعمال کی نشانیاں ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر وہ چیز جو دینِ الٰہی کی علامت یعنی "شعائر" ہو اس کے احترام کو بارگاہِ خداوندی میں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے لہٰذا اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انبیاءؑ اور اولیائے خدا کو اللہ کے دین کی اہم ترین علامت قرار دینا ایک طبعی امر دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ افراد تھے جنہوں نے عوام الناس میں دین کی تبلیغ و ترویج میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو انصاف پسند ہے اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کی اہلبیت علیہم السلام کا وجود اسلام کے مقدس آئین کی حقانیت کا ثبوت اور علامت نہیں ہے نیز وہ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ان ذواتِ مقدسہ کی قبور اور روضہ ہائے مبارکہ کی حفاظت کرنا شعائر اللہ کی تعظیم میں شامل نہیں ہے۔

بہرحال اگر دو مندرجہ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اولیائے خدا کی قبور کا احترام شعائر اللہ کی تعظیم میں شامل ہے۔

الف۔ اولیائے خدا خصوصاً وہ ذاتِ مقدسہ جنہوں نے دین کے فروغ کے لئے اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔ ان کی قبور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی علامت کا حکم رکھتی ہیں۔

ب۔ اولیائے خدا کی تعظیم اور احترام کا ایک طریقہ اس دارِ فانی سے ان کی رحلت کے بعد ان کی قبروں کی حفاظت کرنا بھی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیشِ نظر دنیا کی تمام اقوام میں قابلِ احترام شخصیتوں کو چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی شخصیتیں جہاں کہیں بھی سپردِ خاک کیا جاتا ہے وہاں ان کی قبور کو اپنے مکتب اور راہ و روش کی

علامت کے طور پر محفوظ رکھنے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید نے واضح طور پر ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم جناب رسولِ اکرم (ص) کے اقرباء سے مودّت اختیار کریں، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ:۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۔

(سورۃ۔ شوریٰ، آیت۔ ۲۳)

ترجمہ:۔

اے رسول! کہہ دیجئے! میں تم سے اس کا (اپنی رسالت کا) کوئی اجر نہیں مانگتا مگر سوائے اس کے کہ تم میرے اقرباء سے مودّت اختیار کرو۔

لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ:

وہ افراد جنہیں اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے کیا ان کے خیال میں اہلبیتِ رسول (ص) سے اظہارِ مودّت کے لئے ایک طریقہ ان ذواتِ مقدسہ کی قبور کی حفاظت کرنا نہیں ہے؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ پوری دنیا کی اقوام میں یہ رسم آج بھی موجود ہے کہ وہ اپنے لئے قابلِ احترام شخصیات کی قبور کی حفاظت کرنا ان مایۂ ناز شخصیتوں سے اظہارِ عقیدت کا اہم طریقہ خیال کرتی ہیں اور یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ مختلف اقوام اپنی اہم سیاسی، علمی اور مذہبی شخصیتوں کو چرچ یا مشہور و معروف مقامات پر سپردِ خاک کرنے کے علاوہ ان اہم شخصیتوں کی آخری آرام گاہ کے اردگرد پھولوں کی کیاریاں اور درخت وغیرہ لگاتی ہیں۔

۳۔ اس کے علاوہ قرآنِ حکیم میں بھی بعض ایسی آیات موجود ہیں جنہیں "قبور کے احترام" کے سلسلے میں بطورِ استدلال پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قبل از اسلام بھی دنیا کی اقوام میں "قبور کے احترام" کی رسم موجود تھی۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں اصحابِ کہف کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اِبْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا

ترجمہ۔ ان کی قبور پر عمارت تعمیر کرو

وَقَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا

ترجمہ۔ اور وہ لوگ جنہوں نے غلبہ حاصل کر لیا اپنے کام میں یہ کہنے لگے کہ ان کی قبور پر ہم مسجد تعمیر کریں گے۔

یاد رہے کہ قرآن حکیم میں مذکورہ بالا دو نظریات کو بیان کیا گیا ہے اور ان نظریات پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی گئی ہے اور یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ نظریہ غلط نہیں ہے اس لیے کہ اگر یہ نظریات غلط اور قابلِ اعتراض ہوتے تو خداوند عزّ وجل قرآن حکیم میں ان کا ذکر کرنے کے بعد اس قسم کے نظریات رکھنے والوں کے اعمال کو قابلِ اعتراض ضرور قرار دیتا۔ لیکن قرآن حکیم میں کہیں اس قسم کی بات بیان نہیں کی گئی جو مذکورہ نظریات کے غلط ہونے کی دلیل بن سکے لہٰذا یہ کہنا قطعی بجا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں ان نظریات کو بیان کر کے واضح کیا گیا ہے کہ اولیائے کرام اور صالحینِ عظام کی تعظیم و تکریم کا ایک طریقہ ان کی قبور کی حفاظت کرنا اور ان پر عمارتیں (مقبرے وغیرہ) تعمیر کرنا بھی ہے۔

بہرحال! اگر مذکورہ بالا تینوں آیاتِ مبارکہ کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے۔ تو پھر کسی صورت میں بھی اولیاء اللہ اور صالحینِ کرام کی قبروں پر تعمیر کو مکروہ یا فعل حرام قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان آیاتِ کریمہ کی روشنی میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مذکورہ عمل "شعائرِ الٰہی" کے احترام اور دینِ حنیف کی ہمیشہ یاد رکھی جانے والی شخصیتوں سے اظہارِ عقیدت کی دلیل ہے۔

ب۔ تعمیرِ قبور کے سلسلے میں امّتِ مسلمہ کا نظریہ

جب جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے نور نے پھیلنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس نورِ ہدایت کی کرنوں نے مشرقِ وسطیٰ کے ایک بہت بڑے خطے کو اپنے حصار میں لے لیا تو اس زمانہ میں بھی وہ انبیائے ماسبق جن کے مدفن معلوم تھے اُن پر تاریخ گواہی دیتی ہے کہ نہ صرف چھت یا سائبان موجود تھے بلکہ ان انبیائے ماسبق کی قبروں پر گنبد وغیرہ بھی تھے اور قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ عصرِ حاضر میں بھی ان انبیائے برحق میں سے کچھ کی قبور پر گنبد یا عمارتیں موجود ہیں۔

مکہ مکرمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ماجدہ جناب ہاجرہ کی قبریں "حجر" میں موجود ہیں اس کے علاوہ "شوش" نامی علاقے میں حضرت دانیال اور عراق میں حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت یونسؑ اور حضرت ذوالکفل کی قبریں آج بھی مرجع خاص و عام ہیں۔ نیز حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے فرزند جناب اسحٰق، جناب یعقوب اور جناب یوسف کی قبریں جن کے اجساد کو جناب موسیٰ نے مصر سے بیت المقدس منتقل کیا تھا ان کی قبریں نہ صرف یہ کہ مقبوضہ اردن کے علاقے میں آج بھی موجود ہیں بلکہ ان قبروں پر تعمیر شدہ عمارتیں اور گنبد بھی دیکھے جا سکتے ہیں مزید برآں حضرت حوا کی قبر بھی "جدہ" میں موجود ہے جس کے آثار کو آلِ سعود نے اس علاقے پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد مٹا دیا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب اس ملک پر "مسلمانوں" نے فتح حاصل کر کے قبضہ حاصل کیا تو ان "مسلمانوں" کو اس سرزمین پر پائے جانے والے اماکنِ مقدسہ کے آثار دیکھ کر بالکل غصہ نہ آیا اور نہ ہی ان آثار کو مسمار کر دینے کا حکم جاری کیا۔

بہرحال قابلِ غور و فکر یہ امر ہے کہ اگر واقعاً قبور کی تعمیر اور گنبدوں کے سائے میں میت کو سپردِ خاک کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق فعل حرام ہے تو پھر کیا یہ سوال کرنا درست نہیں کہ کیا ایسی صورت میں آغازِ اسلام سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں اور خود جناب رسولِ اکرم (ص) کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے زمانہ میں ہی اس قسم کے تمام آثار چاہے وہ اردن میں تھے یا عراق میں یا پھر کسی دوسری جگہ انہیں مسمار کرتے اور اگر کوئی ان آثار کی تعمیر کرانا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے منع کرتے؟

لیکن تاریخ اسلام میں ہمیں کہیں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا بلکہ اس کے برعکس یہی بات نظر آتی کہ اس زمانہ میں بھی نہ صرف یہ کہ اس قسم کی قبور اور گنبدوں کو مسمار کرنے سے اجتناب کیا گیا بلکہ گذشتہ چودہ صدیوں تک مسلسل ان اماکنِ مقدسہ کی تعمیر و حفاظت پر بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں زمانہ صدرِ اسلام سے لے کر اب تک مسلمانوں نے خداداد عقل کے ذریعے انبیائے خدا کی قبور کی تعمیر و حفاظت کو ان انبیائے کرام سے اظہارِ عقیدت و احترام کا ایک اہم طریقہ خیال کیا اور اس کام کی انجام دہی کو اپنے لئے رحمتِ خداوندی سے فیض یاب ہونے کا اہم وسیلہ قرار دیئے

"ابن تیمیہ" اپنی کتاب "الصراط المستقیم" میں رقمطراز ہے کہ،

اگرچہ فتح بیت المقدس کے موقع پر انبیائے خدا کی قبور پر گنبد اور عمارتیں وغیرہ موجود تھیں تاہم ۴۰۰ برس تک ان انبیائے خدا کے مقبروں کے دروازے بند رہے تھے (مزید تفصیلات جاننے کے لئے دیکھئے کشف الارتیاب ۔ص ۳۸۴)

لہٰذا سوچنے کی بات ہے کہ اگر واقعاً قبور پر کسی قسم کی عمارت یا گنبد کی تعمیر حرام ہوتی تو پھر کیا فطری طور پر اس قسم کی عمارتوں کو مسمار کرنا فعلِ واجب نہیں کہلائے گا؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ مذکورہ بالا قبور انبیا پر گنبد اور عمارتیں تو ۴۰۰ برس تک موجود رہیں۔ البتہ صرف ان کے دروازے بند رکھے گئے؟ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان آثار کو جلد از جلد مسمار کیا جاتا

مختصر یہ کہ ان گنبدوں اور مقبروں کا اتنے عرصے تک باقی رہنا اور علمائے اسلام اور اکابرینِ اسلام کا ان کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی اس بات کے جواز کی بہت بڑی دلیل ہے کہ ایسی عمارتیں دینِ متینِ اسلام میں جائز ہیں۔

اسلامی آثار، درحقیقت اصالتِ دین کا ثبوت ہیں

اصولی طور پر آثارِ نبوت خصوصاً جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبرِ مبارک، آنحضور (ص) کی ازواج، ذرّیت اور اصحاب کے مدفن یا وہ مقامات جہاں وہ اپنے گھروں میں زندگی بسر کرتے تھے (یعنی ان کے گھروں کی) یا پھر وہ مساجد جہاں وہ نماز بجا لایا کرتے تھے ان کی حفاظت کرنا ایک ایسا عمل ہے جسکے بیشمار فائدے ہیں ہم ان فوائد کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اس وقت جبکہ حضرت عیسٰی کی ولادت سے شروع ہونے والے عیسوی سن کے دو ہزار برس گزرنے والے ہیں حضرت عیسٰی، ان کی والدہ جناب مریمؑ اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل کے علاوہ جناب عیسٰی کے حواریوں کا وجود مغرب والوں میں ایک تاریخی افسانے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مشرق کے بعض ماہرین حضرت عیسٰی جنہیں "مسیح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کی ماں کا نام مریم ہے اور جن پر نازل ہونے والی کتاب انجیل کے نام سے مشہور ہے ان کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہیں۔ خود کو ماہرین کہنے والا یہ گروہ جناب عیسٰی کو "مجنون عامری"

اور اس کی معشوقہ لیلٰی کی طرح ایک ایسا افسانہ سمجھ رہا ہے جو صرف اور صرف تصورات اور تخیلات کی پیداوار ہے۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ آخر ایسا کیوں ہے کیا اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ حضرت عیسٰی کی کوئی زندہ اور جیتی جاگتی علامت یا نشانی موجود نہیں ہے؟ جی ہاں بالکل ایسا ہی ہے مثال کے طور پر وہ جگہ جہاں حضرت عیسٰی کی ولادت ہوئی یا وہ گھر جہاں آپ رہتے تھے یا پھر وہ مقام جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسٰی کو سپردِ خاک کیا گیا ان میں سے کسی ایک مقام کے بھی آثار عصرِ حاضر میں دکھائی نہیں دیتے اس کے علاوہ حضرت عیسٰی پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب "انجیل" بھی تحریف کا شکار ہو چکی ہے۔ یہ انجیل عصرِ حاضر میں چار مختلف شکلوں میں موجود ہے اور ہر حصے کے آخر میں حضرت عیسٰی کے قتل اور دفن کے بارے میں داستان تحریر ہے حالانکہ یہ مسلم امر ہے کہ اس داستان کا حضرت عیسٰی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسی داستان میں ہی اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ داستان حضرت عیسٰی کی وفات (عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق) کے بعد لکھی گئی ہے جبکہ اکثر محققین اس داستان کو دوسری صدی عیسوی کے ادبیات کا حصہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ قرینِ قیاس ہے یہ امر کہ اگر انبیائے برحق اور ہادیانِ دین کی خصوصیات یا ان سے متعلق آثار کو محفوظ رکھا جائے تو یہ امر واضح طور پر ان کے پیش کردہ آئین اور دستور کی اصالت یعنی حقانیت کے گواہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے (آثار کے) ہوتے ہوئے شک کرنے والوں کے لئے کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس طرح وہ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان بیانگِ دہل اور نہایت فخر کے ساتھ دنیا کے دوسرے عوام (غیر مسلم عوام) کو یہ کہہ رہے ہیں کہ،

اے بنی نوعِ انسان! ایک ہزار چار سو سال قبل سرزمین حجاز میں بنی نوعِ انسان کی رہبری اور ہدایت کے لئے ایک نبیِ برحق اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتے تھے اور اس برگزیدہ نبیؐ نے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی بھی حاصل کر لی۔ اس نبیؐ برحق کی زندگی کی تمام خصوصیات اور آثار آج بھی محفوظ ہیں ان خصوصیات میں ذرہ برابر کمی بیشی کا مشاہدہ ناممکن ہے اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی مسلمانوں کو معلوم ہے کہ وہ (ص) کہاں پیدا ہوئے،

وہ غارِ حرا جہاں آنحضور (ص) پر وحی نازل ہوئی کونسی غار ہے ؛ وہ مسجد جس میں آپؐ نماز پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے کہاں ہے ؛ وہ کونسی جگہ ہے جہاں انہیں سپردِ خاک کیا گیا ؛ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو تو یہ بھی علم ہے کہ وہ کونسے مکانات ہیں جن میں آنحضور (صلعم) ان کی ذرّیت (اولاد) ازواج اور دیگر اقربا رہا کرتے تھے نیز آنحضور کی اہلِ بیت (ع) انکے اوصیاء (ع) خلفا اور ازواج کی آخری آرامگاہیں کہاں کہاں ہیں ؛

لہٰذا اگر عصرِ حاضر میں ان تمام نشانیوں کو جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے مسمار کر دیا جائے تو یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ایسا کرنے سے آنحضور (ص) کے وجود اور ان کے پیش کردہ دینِ برحق کی اصالت یعنی حقانیت ختم ہوجائے گی چنانچہ یہ کہنا قطعی بجا معلوم ہوتا ہے کہ آثارِ رسالتِ عظمیٰ اور خاندانِ رسالت جو خاندانِ عصمت و طہارت ہے انہیں مسمار کرنا نہ صرف یہ کہ بے احترامی کی دلیل ہے بلکہ اسلام کی نشانیوں اور حقانیتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مٹانے کے جرم کا ارتکاب کرنے کے مترادف بھی ہے۔

آئینِ اسلام ایک ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والا آئین ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہی وہ آئین (دین) ہے جو عالمِ بشریت کی رُشد و ہدایت کے لئے تا قیامِ قیامت باقی رہے گا۔ وہ نسلیں جو آج سے ایک ہزار سال کے بعد معرضِ وجود میں آئیں گی انہیں بھی اسلام کی حقانیت پر اتنا ہی یقین ہونا چاہیے جتنا عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو ہے۔ اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم رسالتِ عظمیٰ کے آثار اور اس دینِ حنیف کی نشانیوں کی حفاظت کرنا اپنا اہم ترین اور اوّلین فریضہ خیال کریں کیونکہ ایسا کرنا ہی مستقبل میں دینِ اسلام کی بقائے کے لئے کارنامہ انجام دینا کہلائے گا۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی نبوت کی طرح جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور رسالتِ عظمیٰ کے بارے میں بھی شک کیا جانے لگے۔

ہم اس مقام پر اس امر کا ذکر کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے کافی حد تک جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار اور دینِ اسلام کی نشانیوں یعنی "شعائر اللہ" کی حفاظت کا کام بحسن و خوبی انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں اس لئے کہ جنابِ رسولِ اکرم (ص)

کی حیاتِ طیبّہ کی خصوصیات کو نہایت عمدہ اسلوب کے ساتھ کتابوں میں بیان کر کے انہیں محفوظ کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ آنحضور (ص) کی انگشتری، جوتوں، مسواک، شمشیر، زرہ، نیزے کھانا کھانے، پانی پینے کی کیفیت اخلاقی خصوصیات اور خضاب جو آنحضور (ص) استعمال کیا کرتے تھے ان کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ۔ آنحضور (ص) کھانے میں کیا پسند فرماتے تھے غلام کے ساتھ آنحضور کا سلوک کس قسم کا ہوتا تھا، وہ زمین جو آپ نے وقف فرمائی اس کی تفصیلات کیا ہیں نیز اسی قسم کے دیگر متعدد امور کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں جس کی وجہ سے آج بھی ان امور کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں (دیکھئے کتاب طبقات ابن سعد ج۔۱ ص۔۳۶۔ تا ۵۰۳ تک)

مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعے اور طویل و عریض اسلامی ممالک کا تفصیلی دورہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ قبروں کی تعمیر اور ان کی حفاظت و مرمت وغیرہ کا رواج تمام اسلامی ممالک میں عام رہا ہے چنانچہ آج بھی اکثر اسلامی ممالک میں انبیائے خدا اولیائے عظام اور صالحین کی قبریں اور مزار موجود ہیں۔ نیز یہ آثار جنہیں اسلامی آثار میں شمار کیا جاتا ہے ان کی حفاظت کے لئے اوقاف کے ادارے موجود ہیں جن کی آمدنی انہی آثارِ اسلامی کی حفاظت پر خرچ کی جاتی ہے۔

"نجد میں وہابی طبقے کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جب حرمین شریفین اور ان کے نواحی علاقوں پر وہابیوں نے قبضہ کیا تو اس وقت تاریخ گواہی دیتی ہے کہ شام اور حجاز کے علاقوں میں اولیاء اللہ اور انبیائے خدا کی قبور اور مزار معمور و آباد تھیں۔ انبیائے خدا، اولیائے کرام اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی زیارت گاہیں مرکزِ خاص و عام بنی ہوئی تھیں۔ لیکن مسلمان علماء میں سے کسی نے بھی ان کے اس طرح موجود ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ یہ مسئلہ صرف ایران تک محدود نہیں ہے جہاں اولیائے کرام اور اللہ کے نیک بندوں کی قبریں مزاروں کی شکل میں معمور و آباد ہیں بلکہ دیگر اسلامی ممالک خاص طور پر مصر شام، عراق، مراکش اور تیونس وغیرہ میں بھی علماء، عظیم اسلامی شخصیتوں اور اولیائے کرام کے مزار موجود ہیں اور مسلمانوں

کی بہت بڑی تعداد جوق در جوق ان مزارات کی زیارت اور وہاں فاتحہ و قرآن خوانی کے لئے جاتی رہتی ہے ان مقامات پر خادم اور نگہبان متعین ہیں نیز کچھ افراد کو ان مقدس مقامات کی صفائی اور دیکھ بھال پر بھی مامور کیا گیا ہے۔

قبور کی تعمیر کی یہ رسم جو کہ تمام اسلامی ممالک میں اسقدر وسیع پیمانے پر موجود ہے اس کے بارے میں کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ "حرام" ہے وہ بھی اس صورت میں جبکہ زمانہ صدر اسلام سے ہی یہ رسم مسلسل چلی آرہی ہے۔ یہ رسم جسے علمائے اسلام کی اصطلاح میں "سیرتِ مسلمین" کہا جاتا ہے اس کا تعلق جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانے سے ہے لہٰذا اس قسم کی سیرت کا وجود خود اس رسم کے جائز اور مقبولیت رکھنے کی دلیل ہے چنانچہ کسی صورت میں بھی اس رسم پر اعتراض کرنا درست دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ قبور کی تعمیر و بقا کے خلاف اظہارِ خیال اسی طرح غلط ہے جس طرح خود ایک وہابی مصنف اسے غلط خیال کرتے ہوئے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ :۔

هَذَا اَمْرٌ عَمَّ الْبِلَادَ وَطَبَّقَ الْاَرْضَ شَرْقًا وَغَرْبًا بِحَيْثُ لَا بَلْدَةَ مِنْ بِلَادِ الْاِسْلَامِ اِلَّا فِيْهَا قُبُوْرٌ وَمَشَاهِدُ بَلْ مَسَاجِدُ الْمُسْلِمِيْنَ غَالِبًا لَا تَخْلُوْا عَنْ قَبْرٍ وَمَشْهَدٍ وَلَا يَسَعُ عَقْلُ عَاقِلٍ اِنَّ هَذَا مُنْكَرٌ يَبْلُغُ اِلٰى مَا ذَكَرْتَ مِنَ الشَّنَاعَةِ وَيَسْكُتُ عُلَمَاءُ الْاِسْلَامِ

(تطہیر الاعتقاد۔ ص ۱۷۔ طبع مصر۔ نقل از کشف الارتیاب)

ترجمہ :

یہ رسم مشرق و مغرب کے تمام شہروں میں رائج ہے یہاں تک کہ کوئی اسلامی شہر (ملک) ایسا نہیں ہے جہاں کوئی قبر یا مزار وغیرہ موجود نہ ہو حتیٰ کہ مسلمانوں کی مساجد تک میں قبریں موجود ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی صاحبِ عقل کسی صورت بھی اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی رسم حرام ہے وہ بھی اس صورت میں کہ (اس رسم کے ہوتے ہوتے بھی) علمائے اسلام خاموشی اختیار کریں۔

مگر قابل افسوس امر تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا حقیقت کے اعتراف کے بعد اسی مصنف نے

نہ جانے کس طرح اپنی ہٹ دھرمی کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ،

کسی رسم و رواج کے بارے میں علما کا سکوت (خاموشی) اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ رسم درست اور جائز ہے اس لئے کہ اگر کچھ لوگوں نے کسی مصلحت کی خاطر خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو قطعی طور پر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسری شرائط کے تحت حقیقت کے اظہار میں مصروف ہیں۔

اس کے علاوہ قابل صد تعجب ہے وہ جواب جسے مدینہ منورہ کے علمائے منسوب کیا گیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ :

اَمَّا الْبِنَاءُ عَلَى الْقُبُوْرِ فَهُوَ مَمْنُوْعٌ اِجْمَاعًا لِصِحَّةِ الْاَحَادِيْثِ الْوَارِدَةِ فِيْ مَنْعِهَا وَلِهَذَا اَفْتٰى كَثِيْرٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ بِوُجُوْبِ هَدْمِهِ۔

ترجمہ

قبور پر عمارت کی تعمیر علماء کے نزدیک متفقہ طور پر ناجائز ہے کیونکہ اس ضمن میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں وہ سب کی سب صحیح ہیں چنانچہ اسی لئے اکثر علماء نے ان کو مسمار کرنے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

مگر کوئی ان سے پوچھے تو سہی کہ قبروں پر گنبد یا عمارت وغیرہ کی تعمیر کو حرام قرار دینے کے فتویٰ کو کیونکر متفقہ فتویٰ کہا جا سکتا ہے جبکہ مسلمانوں نے جناب رسول اکرم (ص) کو اسی حجرہ میں سپردِ خاک کیا جس میں آنحضور (ص) اپنی زوجہ حضرتِ عائشہؓ کے ہمراہ رہتے تھے اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو بھی متبرک مقام کی بنا پر آنحضور صلعم کے پہلو میں اسی حجرے میں ہی دفن کیا گیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ حجرے کے ایک حصہ میں حضرتِ عائشہ رہتی تھیں، جبکہ دوسرے حجرے میں جناب رسولِ خدا (ص) اور شیخین کی قبریں تھیں پھر عبداللہ بن زبیر نے اپنے زمانے میں دونوں حصوں کے درمیان موجود دیوار جس کی اونچائی کم تھی اس کی اونچائی میں اضافہ کرایا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں فنِ معماری کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق وہ حجرہ جو مدفن رسولِ خدا (ص) ہے اس میں مناسب تبدیلیاں مرمت کے ذریعے لائی جاتی رہی ہیں۔ بنوامیہ اور بنو عباس کے دورِ خلافت میں آنحضور (ص) کی قبرِ مبارک پر خاص طور پر گنبد تعمیر کیا گیا جس کے بعد ہر زمانے میں فنِ معماری کی خصوصیات سے اس عمارت کو سنوارنے کا عمل جاری رکھا گیا ہے

جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا روضہ مبارک اور اس پر موجود گنبد کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس موجودہ عمارت اور گنبد کو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں بنایا گیا تھا اس عمارت کی تعمیر کا آغاز ۱۲۷۰ ھجری بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ عمارت چار سال کے عرصے میں مکمل ہوئی تھی۔ (جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روضۂ مبارک کی مفصّل تاریخ اور مختلف اسلامی ادوار میں اس روضۂ مبارک میں جو مختلف تبدیلیاں کی گئی ہیں ان کی تفصیل "سمہودی" کی کتاب "وفاء الوفاء" (ص۔۳۸۳ ۔ ۳۹۰) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ نیز اس کتاب کے علاوہ تاریخ مدینۂ منورہ سے متعلق دیگر کتب میں بھی روضۂ رسولِ مقبول (ص) میں لائی جانے والی تبدیلیوں کا حال بیان کیا گیا ہے)

ج، حدیث ابی الهیاج

مذکورہ بالا بحث کے بعد اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم اس حدیث کا بھی تجزیہ پیش کریں جسے تحت وہابی طبقہ، قبور پر گنبد اور عمارت کی تعمیر کو حرام خیال کرتا ہے۔ سب سے پہلے ہم اسی حدیث کو صحیح مسلم کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ صحیح مسلم نے اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے کہ:

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَحْيَى وَ اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِي شَيْبَةَ وَ زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: يَحْيَى اَخْبَرَنَا وَ قَالَ الْاٰخَرَانِ: حَدَّثَنَا وَكِيعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ حَبِيبِ بْنِ أَبِي ثَابِتٍ عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنْ أَبِي الْهَيَّاجِ الْاَسَدِيِّ قَالَ لِي عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ (ص) أَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّيْتَهُ.

(دیکھئے صحیح مسلم ۔ج ۔۳ ۔ کتاب الجنائز ۔ص ۔ ۶۱۔ اور سنن ترمذی ۔ج ۔۲ ۔ص ۲۵۶ باب ماجاء فی تسویۃ القبر۔ نیز دیکھئے سنن نسائی ج ۔۴ ۔ باب تسویۃ القبر ص ۔۸۸)

صحیح مسلم کے مولف نے اس حدیث کو تین افراد یعنی یحییٰ ابوبکر اور زہیر کے حوالے سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ وکیع نے سفیان سے، سفیان نے حبیب سے، حبیب نے ابی وائل سے اور ابی وائل نے ابی الهیاج کے حوالے سے بتایا ہے کہ مجھ سے یعنی ابی الهیاج

حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) نے کہا کہ میں تجھے وہ کام سونپ رہا ہوں جس کی مجھے (علی کو) جناب رسولِ اکرم (ص) نے تلقین فرمائی تھی (اور وہ کام یہ ہے کہ تم) کسی بھی تصویر کو نیست و نابود کیے بغیر اور کسی بھی قبر کی بلندی کو مسادی اور برابر کئے بغیر مت چھوڑو، (آرام سے مت بیٹھو)

مذکورہ حدیث کے بارے میں ہمارا نظریہ

جب کبھی بھی ہم چاہیں کہ حدیث کو احکامات الٰہیہ کے سلسلے میں بطور استدلال پیش کریں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھیں کہ اس حدیث میں درج ذیل دو شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں:

۱۔ حدیث مستند ہے یعنی حدیث بیان کرنے والے خواہ کسی طبقے یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں ایسے افراد ہونے چاہیں جو قابلِ اعتماد ہوں۔

۲۔ حدیث کا مفہوم ہمارے مطلوب کے سلسلے میں واضح ہو یعنی حدیث کے الفاظ اور کلمات ہمارے مقصود کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں اس حدیث کا جو مفہوم ہم بیان کریں اسی مفہوم کو ہر وہ فرد بیان کرے جو حدیث کی زبان اور خصوصیات کا علم رکھتا ہے۔

قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث دو لحاظ سے جھگڑے کی بنیاد رہی ہے۔ خاص بات تو یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ اس مفہوم کو واضح نہیں کرتے جسے وہابی مسلک کے افراد ثابت کرنے کے لئے اس حدیث کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک اس حدیث کے مستند اور صحیح ہونے کا مسئلہ ہے تو اس حدیث کو بیان کرنے والے وہ افراد ہیں جنہیں حدیث شناس دانشمند اور علما قابلِ اعتماد نہیں مانتے کیونکہ اس حدیث کو بیان کرنے والوں میں

۱۔ وکیع ۲۔ سفیان الثوری ۳۔ حبیب بن ابی ثابت اور ۴۔ ابوائل الاسدی نظر آتے ہیں جبکہ "حافظ ابن حجر عسقلانی" جیسے حدیث شناس نے اپنی کتاب "تہذیب التہذیب"

میں مذکورہ افراد کو کچھ اس انداز سے ہدف تنقید قرار دیا ہے کہ انسان اس حدیث اور اسے بیان کرنے والے افراد سے منقول دیگر احادیث کے بارے میں شک و شبہ کرنے لگتا ہے۔

مثال کے طور پر "وکیع" کے بارے میں اس (حافظ ابن حجر عسقلانی) نے امام احمد حنبل کے حوالے سے لکھا ہے کہ إِنَّهُ أَخْطَأَ فِي خَمْسِمِأَةِ حَدِيْثٍ۔ (دیکھئے تہذیب التہذیب ج - ۱۱ - ص - ۱۲۵) ترجمہ - اس (وکیع) نے پانچ سو احادیث میں غلطی کی ہے۔

اسی طرح "محمد بن نصر مروزی" کہتا ہے کہ: كَانَ يُحَدِّثُ بِالْمَعْنٰى وَلَمْ يَكُنْ مِنْ أَهْلِ اللِّسَانِ۔ وہ حدیث کے مفہوم کو بیان کرتا تھا (جبکہ حدیث کے متن اور اس کے اصل الفاظ نقل نہیں کرتا تھا) حالانکہ وہ اہل زبان بھی نہیں تھا (جس کی وجہ سے یہ کہا جا سکے کہ اس کے لئے حدیث کے الفاظ بدل کر بیان کرنا قابل اعتراض نہیں ہے)

سفیان ثوری کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن مبارک کے حوالے سے لکھا

حَدَّثَ سُفْيَانُ بِحَدِيْثٍ فَجِئْتُهُ وَهُوَ يُدَلِّسُهُ فَلَمَّا رَآنِي اسْتَحْيٰى

ترجمہ:

سفیان حدیث بیان کر رہا تھا کہ اتفاق سے میں (ابن مبارک) بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ حدیث بیان کرنے میں کچھ چھپا رہا ہے جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ (دیکھئے تہذیب التہذیب ج - ۴ ص ۱۱۵)

اب حدیث بیان کرنے کے دوران کسی چیز کو چھپانے کے بارے میں چاہے جو مرضی کہا جائے تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ جو کوئی بھی حدیث میں سے کسی چیز کو چھپاتا ہے اس کا یہ عمل اس امر کی دلیل بن جاتا ہے کہ وہ ملکۂ عدالت، سچی بات کہنے اور حقیقت کو بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اسی لئے غیر حقیقت کو حقیقت کا روپ دینے کی سعی کرتا ہے۔

"یحیٰی القطان" کے ترجمے میں اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سفیان نے کوشش کی تھی کہ غیر معتبر شخص کو معتبر ثابت کرے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ (دیکھئے تہذیب التہذیب ج - ۱۱، ص - ۲۱۸)

"حبیب ابن ابی ثابت" کے بارے میں "ابی حبان" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ

كَانَ مُدَلِّسًا یعنی وہ حدیث میں سے کچھ چھپاتا تھا جبکہ مؤخر الذکر کے بارے میں ہی "عطا" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ: لَا يُتَابَعُ عَلَيْهِ وَلَيْسَتْ مَحْفُوظَةٌ یعنی اس کی (نقل شدہ) احادیث کی پیروی نہیں کی جا سکتی اور اس کی احادیث علم (معتبر) نہیں ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ج - ۳ - ص ۱۷۹)

رہ گیا "وائل" تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "نواصب" یعنی اس گروہ میں تھا جو جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منحرف ہو چکا تھا۔ (دیکھئے شرح حدیدی ج - ۱۲، ص - ۲۲۳)

لہٰذا ایک ایسی حدیث جس کے معتبر ہونے کے سلسلے میں مذکورہ بالا نوعیت کے اعتراضات پیدا ہوں اسے کوئی بھی فقیہ تو مستند یعنی معتبر قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی اسے کسی فتویٰ کے سلسلے میں بطور سند پیش کر سکتا ہے پھر سب سے اہم ترین مسئلہ اس حدیث کے الفاظ اور اس کا مفہوم ہے جو خود اسے سند قرار نہ دینے کی دلیل ہے اس لئے کہ مذکورہ بالا حدیث کے درج ذیل الفاظ کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ،

وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ

مذکورہ بالا عبارت میں دو الفاظ کے مفہوم پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

الف - مُشْرِفًا - ب - سَوَّيْتَهُ

الف: لغت میں لفظ "مشرف" کے معنی عالی اور بلند بیان کئے گئے ہیں

اَلْمُشْرِفُ مِنَ الْأَمَاكِنِ الْعَالِيْ وَالْمُطِلُّ عَلٰى غَيْرِهٖ

مشرف سے مراد بلند جگہ یا ایسی جگہ ہے جو کسی دوسری جگہ پر مسلط ہو (دیکھئے المنجد - مادہ شرف) اس ضمن میں "القاموس" کا مؤلف جو الفاظ کے معانی بیان کرنے کے مسئلہ پر بھرپور توجہ دینے میں مشہور ہے اس کا کہنا ہے کہ،

اَلشَّرَفُ مُحَرَّكَةً: اَلْعُلُوُّ وَمِنَ الْبَعِيْرِ سَنَامُهُ

"شرف" "ر" پر زبر کے ساتھ - بلند اور اونٹ کی کوہان والے حصے کو کہا جاتا ہے۔

گویا مذکورہ بالا معانی کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ "مشرف" مطلق بلند اور [illegible]

سے ایسی بلندی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کوہان سے مشابہ ہو یا پھر قرائن کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس لفظ سے کس قسم کی بلندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

ب۔ لغت میں لفظ "تَسْوِیَۃ" کے معنی مساوی اور برابر کرنے یا پھر ٹیڑھے اور اونچے نیچے حصے کو صحیح اور سیدھا کرنے کے ہیں۔

سَوِیَ الشَّیْءُ: جَعَلَهُ سَوِیًّا یُقَالُ سَوَّیْتُ الْمُعْوَجَ فَمَا اسْتَوٰی صُنْعَهُ مُسْتَوِیًا۔

سوی الشی: یعنی کسی شے کو سیدھا کیا۔ عرب کہتے ہیں۔ میں ٹیڑھے کو سیدھا کرنا چاہتا تھا مگر وہ سیدھا نہ ہوا۔ اس کے علاوہ یہی لفظ بے عیب مصنوع کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (سورۃ الاعلیٰ آیت ۲)

یعنی اللہ وہ ہے جس نے خلق کیا اور پھر اسے مکمل بھی کیا۔

لہٰذا ان الفاظ کے مذکورہ بالا معانی جاننے کے بعد ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کا مفہوم کیا ہے۔

کیونکہ مذکورہ حدیث میں دو امور کا احتمال موجود ہے اس لئے جزئیات کا مفہوم اور دیگر قرائن کو پیش نظر رکھ کر ہی کسی ایک مفہوم کو حتمی قرار دیا جا سکتا ہے

۱۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ابو الہیاج کو حکم دیا ہو کہ وہ بلند قبروں کو مسمار کر دے یا پھر انہیں زمین کے برابر کر دے۔

لیکن وہ امکان جس پر وہابی گروہ مصر ہے۔ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔

الف: اس لئے کہ لفظ "تسویۃ" مسمار کرنے اور ڈھانے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ پھر اگر یہی مفہوم مراد ہوتا تو اسے بیان کرنے کے لئے یہ کہا جانا چاہیے تھے کہ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَهُ بِالْاَرْضِ ۔یعنی اسے زمین کے برابر کر دو۔ لیکن حدیث میں اس قسم کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔

ب: اگر حدیث کا مفہوم وہی ہے جو وہابیوں نے بیان کیا ہے تو پھر آخر کیا وجہ ہے دیگر فرقوں کے علماء میں سے کسی نے بھی اس حدیث کے مطابق فتویٰ صادر نہیں فرمایا؟

گویا ان دو عوامل گویا احتمالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا قطعی بجا معلوم ہوتا ہے کہ قبر بالکل برابر کر دینا سنتِ اسلامی کے خلاف ہے جبکہ اسلامی احکامات کے مطابق سنت یہی ہے کہ قبر کسی حد تک سطح زمین سے بلند ہو چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیش نظر تمام علمائے اسلام نے قبر کی زمین سے ایک بالشت بلندی کو مستحب قرار دیا ہے۔

الفقہ علی مذاہب الاربعۃ نامی کتاب جو مشہور و معروف چار اماموں کے فتاویٰ کے مطابق ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ،

وَیُنْدَبُ اِرْتِفَاعُ التُّرَابِ فَوْقَ الْقَبْرِ بِقَدْرِ شِبْرٍ۔

(دیکھئے مذکورہ کتاب۔ ج ۱۔ ص ۴۲۰) یعنی مستحب یہ ہے کہ قبر کی خاک سطح زمین سے ایک بالشت اونچی ہو۔

۲۔ ممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے یہ حکم دیا ہو کہ ایسی قبروں کو ہموار کیا جائے جو مچھلی کی کمر یا اونٹ کی کوہان کی طرح بنائی گئی ہوں دوسرے الفاظ میں اس حدیث کے ذریعے مذکورہ قسم کی قبروں کے اوپر کے حصے کو سطح، یکساں اور ہموار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس احتمال کو پیش نظر رکھ کر اگر مذکورہ حدیث کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو پھر ماننا پڑے گا کہ مذکورہ حدیث اس امر کا ثبوت ہے کہ قبر کے اوپر کے حصے کا مساوی ہونا ضروری ہے نیز قبر کے اوپر کے حصے کو مچھلی کی کمر یا اونٹ کی کوہان کی طرح شکل دینا درست نہیں اور یہی اہل سنت کے ممالک میں رائج ہے جو حقیقت میں درست نہیں امام شافعی کے علاوہ اہلسنت کے تین اماموں نے غیر مسطح اور غیر ہموار قبر کو مستحب قرار دیا ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ نامی کتاب کی جلد ۱۔ ص ۴۲۰ پر بیان کیا گیا ہے

وَیُجْعَلُ کَسَنَامِ الْبَعِیْرِ وَقَالَ الشَّافِعِیُّ جَعْلُ التُّرَابِ مُسْتَوِیًا مُسَطَّحًا اَفْضَلُ مِنْ تَسْنِیْمِهٖ ۔ گویا یہ حدیث شیعہ علماء کے اس فتویٰ کی تصدیق کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زمین کی سطح سے قبر کی خاک کا قدرے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ بلکہ صاف اور ہموار ہونا بھی ضروری ہے)

اتفاق سے خود مسلم نے "صحیح" کے مؤلف ہیں اس حدیث کے علاوہ ایک دوسری حدیث

کو جسے ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں باب "الامر بتسویۃ القبر" میں اور ان کے علاوہ "ترمذی" اور "نسائی" نے بھی اسی مذکورہ باب کے تحت اس حدیث کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ سطح قبر کا سطح ہموار ضروری ہے گویا مذکورہ کتب میں "باب الامر بتسویۃ القبر" کے تحت اس حدیث کو بیان کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس عنوان کے تحت یہ واضح کیا گیا ہے کہ اونچی قبروں کی زمین کا برابر ہونا ضروری ہے ورنہ اگر یہ واضح کرنا مقصود ہوتا کہ اس قسم کی قبور کو منہدم کر دینا ضروری ہے تو پھر مذکورہ باب کو "باب الامر بتخریب القبور و ھدمھا" قرار دیا جاتا۔

پھر اتفاق سے عربی زبان میں اگر لفظ "تسویۃ" کو (قبر کی مانند) کسی چیز سے نسبت دے دی جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ صرف وہ خود ہی صاف اور مساوی نہ ہو بلکہ اسے کسی دوسری چیز (جیسے زمین ہے) کی طرح برابر اور مساوی کر دیا جائے۔

آیئے اس حدیث کا جائزہ لیں جسے مسلم نے اپنی کتاب "صحیح" میں بیان کیا ہے اور جو اس امر کی تائید کرتی ہے جس کا اثبات ہمارا مطلوب ہے۔

كُنَّا مَعَ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ بِأَرْضِ الرُّومِ بِرُودِسَ فَتُوُفِّيَ صَاحِبٌ لَنَا فَأَمَرَ فَضَالَةُ بْنُ عُبَيْدٍ بِقَبْرِهِ فَسُوِّيَ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ (ص) يَأْمُرُ بِتَسْوِيَتِهَا.

(دیکھئے صحیح مسلم ج۔ ۳۔ کتاب الجنائز ص۔ ۶۱)

ترجمہ:

راوی کہتا ہے کہ ہم فضالۃ بن عبید کے ہمراہ سرزمین روم میں تھے کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کا انتقال ہو گیا۔ فضالۃ بن عبید نے ہمیں اس کی قبر تیار کرنے کے لئے کہا اور پھر دفن کرنے کے بعد) اس نے (فضالہ نے) قبر کو مساوی یعنی برابر کر دیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ (ص) کو یہ حکم دیتے ہوئے سنا ہے کہ اسے (قبر کو) مسطح رکھا جائے۔

مذکورہ بالا حدیث کو سامنے رکھنے کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم غور کریں کہ "تسویۃ القبر" سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا مقصد قبر پر تعمیر شدہ عمارت یا گنبد وغیرہ کو مسمار کر دینا ہے؟ لہٰذا ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ فرض کریں کہ جب مرنے والے کو دفن کیا جا رہا ہے اس وقت قبر پر

کسی قسم کی کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی کہا گیا ہے کہ "اس نے قبر کو برابر کر دیا" لہٰذا کیونکہ یہ مسلم امر ہے کہ سطح قبر کو زمین کے برابر رکھنا سنت کے منافی ہے اور کہا گیا ہے کہ سطح قبر کا سطح زمین سے تقریباً ایک بالشت اونچا ہونا چاہیے اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعی درست معلوم ہوتا ہے کہ قبر کی سطح جو سطح زمین سے ایک بالشت اونچی ہونا ضروری ہے۔ اسے برابر اور مساوی کیا گیا یعنی اسے مسطح کیا گیا اور یہی "تسویۃ القبر" کا صحیح مفہوم ہے لہٰذا ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اول الذکر حدیث میں جس "تسویۃ القبر" کی تاکید کی گئی ہے اس سے مراد قبر کی سطح کو مساوی رکھنا ہے تاکہ قبر مچھلی کی کمر یا اونٹ کی کوہان کی شکل میں باقی نہ رہے۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بات بھی واضح کر دیں کہ صحیح مسلم کے مشہور شارح جو "نووی" کے نام سے معروف ہیں انہوں نے بھی مذکورہ بالا حدیث کی تشریح بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

إِنَّ السُّنَّةَ بِأَنَّ الْقَبْرَ لَا يُرْفَعُ عَنِ الْأَرْضِ رَفْعًا كَثِيرًا وَلَا يُسَنَّمُ بَلْ يُرْفَعُ نَحْوَ شِبْرٍ وَيُسَطَّحُ. (شرح صحیح مسلم از نووی)

ترجمہ:

سنت یہ ہے کہ سطح قبر زمین کی سطح سے نہ تو زیادہ اونچی ہو اور نہ ہی کوہان کی شکل میں ہو بلکہ سطح زمین سے ایک بالشت اونچی اور مسطح ہونی چاہیے۔

یعنی مذکورہ تشریح خود اس امر کی دلیل ہے کہ صحیح مسلم کے شارح نے بھی لفظ "تسویۃ" کا وہی معنی لیا ہے جسے ثابت کرنا ہمارا مطلوب ہے دوسرے الفاظ میں اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام (ع) نے ابی الہیاج کو نصیحت فرمائی تھی کہ وہ قبور کی سطح کو کوہان اور مچھلی کی کمر کی صورت میں باقی نہ رہنے دے بلکہ ان کو مسطح اور ہموار کرے۔

یہ صرف ہم نہیں ہیں کہ حدیث کی اس طرح تشریح کر رہے ہیں بلکہ ابن حجر قسطلانی نے بھی اپنی کتاب "ارشاد الساری فی شرح صحیح البخاری" میں اس حدیث کی اس طرح تشریح کی ہے وہ کہتا ہے کہ قبر بنانے کے لئے سنت یہی ہے کہ اس کی سطح مسطح اور ہموار ہو اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ "قبروں کو ہموار بنانا" اہل تشیع "یعنی رافضیوں کا شعار (طریقہ) ہے" ہمیں ہرگز ہرگز

اس سنت پر عمل کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

نیز ہمارا یہ کہنا کہ ، سنت یہی ہے کہ قبر کی سطح ہموار ہو ابی الہیاج کی حدیث کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ :۔

لِاَنَّهُ لَمْ يُرِدْ تَسْوِيَتَهُ بِالْاَرْضِ وَاِنَّمَا اَرَادَ تَسْطِيحَهُ جَمْعاً بَيْنَ الْاَخْبَارِ

(ارشاد الساری ۔ ج ۔ ۲ ۔ ص ۴۶۸)

ترجمہ :

کیونکہ مقصد قبر کو زمین کے مساوی کرنا نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قبر کے اوپر کا حصہ زمین کی سطح کی طرح ہموار اور مسطح ہو۔

پھر قابل توجہ یہ امر ہے کہ اگر نصیحت کا مقصد یہ ہوتا کہ گنبد اور اس عمارت کو مسمار کیا جائے جو قبر پر بنائی گئی ہو تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت علی (ع) نے اپنے زمانہ میں ان گنبدوں کو جو کہ انبیائے خدا کی قبروں پر بنے ہوئے تھے انہیں مسمار نہیں کیا؟ حضرت علی (ع) تو اپنے زمانے میں اسلامی ممالک کے علی الاطلاق حاکم تھے فلسطین ، شام ، مصر ، عراق ، ایران اور یمن کی سرزمین میں انبیائے خدا کی قبروں پر بنائی گئی عمارتیں ان کی نگاہوں کے سامنے موجود تھیں ؟

پھر اگر ہم ان تمام دلائل کو پس پشت ڈال کر یہ فرض بھی کر لیں کہ امام (ع) نے ابی الہیاج ، کو یہ حکم دیا تھا کہ تمام اونچی قبروں کو زمین کے برابر کر دو تب بھی کسی صورت میں اس حدیث سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں پر بنے ہوئے گنبد یا عمارت کو مسمار کرنا ضروری ہے اس لئے کہ امام (ع) نے فرمایا ہے کہ :۔

وَلَا قَبْراً اِلَّا سَوَّيْتَهُ

یعنی (بالفرض) قبروں کو مسمار کر (اگر سویتہ کے معنی مسمار کرنا مراد لئے جائیں) یہ تو نہیں کہا گیا کہ

وَلَا بِنَاءً وَلَا قُبَّةً اِلَّا سَوَّيْتَهُ

یعنی چاہے کوئی عمارت ہو یا گنبد انہیں مسمار کرو۔

پھر ہمارا موضوع گفتگو قبروں سے متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق تو ان گنبدوں اور عمارتوں سے ہے جو قبروں پر بنی ہوئی ہیں اور جن کے سایہ میں لوگ قرآن کی تلاوت ، دعا و مناجات اور نماز وغیرہ

پڑھتے ہیں لہٰذا کس طرح اس مذکورہ جملے سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قبروں پر تعمیر شدہ ان عمارتوں کو تباہ و برباد کر دینا ضروری ہے جو زیارت کرنے والوں کو عبادت اور قرآن کی تلاوت کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں اور انہیں (عبادت گذاروں کو) سردی اور گرمی سے محفوظ رکھنے کا باعث بنتی ہیں ؟

آخر میں اس نکتے کو بیان کرنا بھی ناگزیر ہے کہ ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث یا اس قسم کی دیگر احادیث ان سابقہ اقوام کی قبروں کے بارے میں ہوں جنہوں نے نیک اور صالح افراد یا پھر اولیا کی قبروں کو اپنا "قبلہ" قرار دے رکھا تھا اور حقیقی قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کی بجائے ان قبروں کی طرف یا ان تصاویر کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے جو قبر کے برابر ہوا کرتی تھیں گویا اپنے اس عمل سے وہ حقیقی قبلہ کی جانب سے رُخ پھیر لیا کرتے تھے۔ ہاں البتہ اس حدیث کا ان قبور سے کسی صورت بھی کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے جن پر کسی مسلمان نے نہ سجدہ کیا اور نہ ہی اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی ہو اس لئے کہ مسلمان تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر کعبہ کی جانب رخ کر کے ہی نماز پڑھتے یا قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ اگر لوگ نیک اور صالح افراد کی قبور کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اور ان قبروں میں دفن صالح افراد کے طاہر اجداد اور ان کے پاک مدفنوں کے نزدیک خدا کی عبادت کرتے ہیں تو اس کی وجہ ان اماکن (مقامات) کو ان قبور میں دفن نیک ہستیوں کی وجہ سے جو عزت و احترام حاصل ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے کہ :۔

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (سورہ بقرہ ۔ آیت ۱۲۵)

ترجمہ :

اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس جگہ جہاں ابراہیم عبادت کے لئے کھڑا ہوا کرتے تھے اسے اپنا مقامِ نماز قرار دیں۔

اگر مقام (عبادتِ) ابراہیم جناب ابراہیم خلیل اللہ (ع) کی وجہ سے عزت و احترام کی جگہ بن سکتا ہے تو پھر آخر وہ کون سا سبب ہے جسکی بنا پر اولیا اللہ اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے ان نیکوکاروں کے مدفن باعث احترام قرار نہیں پا سکتے جنہوں نے وفن ارجم

اور خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی کی خاطر اپنا سب کچھ راہِ حق پر قربان کر دیا ، یقیناً ایسا ہونا چاہیے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات سے پتا چلتا ہے کہ تمام شرائط کے مطابق ایسے مقامات پر عبادت کرنے اور نماز ادا کرنے والے کو زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔

ذیل میں قبروں پر گنبد یا عمارت کے بارے میں اہل سنت کے چار مذاہب سے تعلق رکھنے والے علما کرام کے ایک فتویٰ کو بیان کیا جا رہا ہے تاکہ حقیقت امر مزید واضح ہو جائے۔

يُكْرَهُ أَنْ يُبْنَى عَلَى الْقَبْرِ بَيْتٌ أَوْ قُبَّةٌ أَوْ مَدْرَسَةٌ أَوْ مَسْجِدٌ

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۔۱۔ ص ۴۲۱)

ترجمہ: قبر پر مکان گنبد، مدرسہ اور مسجد بنانا مکروہ ہے

لہٰذا سوچنا چاہیے کہ جب اہل سنت کے چاروں اماموں کے یہاں متفقہ طور پر "مکروہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو پھر "نجد" کے قاضی کو اس بات پر کیوں اتنا اصرار ہے کہ قبروں پر عمارت یا گنبد کی تعمیر کو "حرام" قرار دیا جائے؟ پھر "مکروہ" ہونے والی بات کے صحیح ہونے کی بھی کوئی دلیل یا سند نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ کسی گنبد یا عمارت کی وجہ سے زیارت کرنے والے کو عبادت کرنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا موقع میسر آتا ہے۔

واقعیت بینی کی بجائے دلیلیں گھڑنا

وہابیوں نے جنت البقیع میں مدفون ائمہ طاہرین (ع) کی قبروں کے گنبدوں کو مسمار کرنے کے لئے جو دلیلیں گھڑنا شروع کی تھیں انہی کے تحت یہ بہانا بھی تراشا گیا کہ بقیع کی سرزمین وقف شدہ زمین ہے اس زمین سے وقف کرنے والے کے مقصد کے مطابق زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے اس لئے ہر وہ امر جو اس زمین سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ بنے اس کا ختم کر دینا ضروری ہے ۔ اہل بیتؑ رسول (ص) کی قبروں پر گنبد اور عمارتیں کیونکہ اس زمین کے ایک حصے سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں یعنی اگرچہ صحن میں دفن کرنا ممکن ہے تاہم باقی حصوں میں عمارت یا گنبد کے ستون پایوں اور اسی طرح چاروں اطراف کی دیواروں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لہٰذا ان گنبدوں یا عمارتوں کا مسمار کیا جانا ضروری امر ہے تاکہ جنت البقیع کی تمام تر زمین کو استعمال میں لایا جا سکے اور واقف

کا اصل مقصد پورا ہو سکے؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی دلیل سوائے ایک ایسے بہانے کے کچھ بھی نہیں ہے جس کے ذریعے "وہابی" قاضی نے ہر قیمت پر اہل بیتؑ رسول (ص) سے تعلق رکھنے والے ائمہ طاہرینؑ کے روضہ ہائے مبارکہ کو نیست و نابود کرنے کی سعی کی تھی اور اگر اس کے پاس کسی قسم کی دلیل نہ بھی ہوتی تب بھی وہ اپنی قدرت و طاقت کے بل بوتے پر ان روضہ ہائے مبارکہ کی بنیادوں تک کو ہلا دینے سے گریز نہ کرتا۔ اس لئے کہ وہابی قاضی نے جنت البقیع کی زمین کے وقف ہونے کے مسئلہ کو اٹھایا ہے جبکہ اس کے وقف ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ

اب تک بھی تاریخ کی کتاب یا حدیث کو جس میں بقیع کی زمین کے وقف ہونے کو بیان کیا گیا ہو بطور ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس امر کا امکان موجود ہے کہ جنت البقیع کی زمین ایک قبرستان رہا ہے اور مدینہ منورہ کے لوگ اپنے مرنے والوں کو وہاں دفن کیا کرتے تھے اور ایسی صورت میں یہ زمین مباحات اولیہ میں شمار ہوتی ہے۔ جس کا کسی طرح بھی استعمال جائز ہے۔

پرانے زمانے میں جب کہ لوگوں کے دلوں میں بنجر یا ایسی زمین جہاں مرنے والوں کو دفن کیا جاتا تھا ان پہ حرص و طمع کی بنا پر نظریں جمائے رکھنے کا رجحان بے حد کم تھا۔ ترقی اور آبادی بڑھانے کا زور و شور نہیں تھا۔ دیہی علاقے کے باشندوں نے شہروں کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ زمین پر ناجائز قبضے یا جائز اور ناجائز طریقے سے زمینوں کی خرید و فروخت کرنے والی ایجنسیاں معرض وجود میں نہیں آئی تھیں اس زمانے میں رسم یہ تھی کہ لوگ اپنے شہر قصبہ یا گاؤں میں زمین کے کسی حصے کو مرنے والوں کے دفن کے لئے مخصوص کر دیتے یا پھر اگر کوئی کسی جگہ اپنے کسی مرنے والے کو دفن کر دیتا تو دوسرے لوگ بھی اپنے مرنے والوں کو اسی علاقے میں دفن کیا کرتے تھے اور اس طرح وہ زمین قبرستان بن جاتی یعنی یہ وہ زمانہ تھا جس میں مرنے والوں کے لئے زمین وقف کرنے کی رسم نہیں پائی جاتی تھی۔ جنت البقیع کی زمین کا بھی یہی حال تھا۔ حجاز اور مدینہ منورہ میں زمین کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی پھر مدینہ منورہ کے اطراف میں کافی زیادہ بنجر زمین کے موجود ہونے کی وجہ سے کسی کو بھی اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ وہ اپنی قابل زراعت زمین کو قبرستان کے لئے وقف کرے۔

کیونکہ ایسے علاقے جہاں کی زیادہ تر زمین بنجر ہو اور قابل زراعت زمین کی کمی ہو وہاں یقیناً بنجر

زمینوں کو جو مباحاتِ اولیہ میں شامل ہیں مرنے والوں کے دفن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اتفاق سے تاریخ بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے چنانچہ "سمہودی" اپنی کتاب "وفاء الوفا فی الاخبار دار المصطفیٰ" میں بیان کرتا ہے کہ:

سب سے پہلے بقیع میں جناب رسولِ اکرم (ص) کے صحابی عثمان بن مظعون کو دفن کیا گیا پھر جب جناب رسولِ خدا (ص) کے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو انہیں بھی جناب رسولِ اکرم (ص) کے حکم کے مطابق عثمان بن مظعون کے برابر دفن کیا گیا۔ اور اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اپنے مرنے والوں کو بقیع میں دفن کرنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے یہاں موجود درختوں کو کاٹا گیا اور اس زمین کے مختلف حصّے مختلف قبیلوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔

اس کے بعد "سمہودی" مزید کہتا ہے کہ

"بقیع میں "غرقد" نامی ایک خاص قسم کا درخت لگا ہوا تھا جسے اس زمین میں عثمان بن مظعون کو دفن کرنے کے موقع پر کاٹا گیا تھا"

(کتاب وفاء الوفا۔ ج۔ ۲۔ ص۔ ۸۴)

(یاد رہے "غرقد" وہ صحرائی درخت ہے جو مدینہ منورہ کے صحراؤں میں جابجا پایا جاتا ہے)

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بقیع کی زمین بنجر زمین تھی اور ایک صحابی کے وہاں دفن ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں آباد قبیلوں میں سے ہر قبیلے نے اپنے لئے ایک حصّہ مخصوص کر لیا تھا تاکہ وہ اپنے مرنے والوں کو یہاں دفن کر سکے۔ مزید برآں نہ صرف یہ کہ کسی بھی تاریخ کی کتاب میں اس زمین کے وقف ہونے کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے بلکہ اکثر کتب میں تحریر ہے کہ بقیع کی زمین کا وہ حصّہ جہاں ائمہ طاہرین (ع) دفن ہیں، وہاں جناب عقیل بن ابو طالب کا گھر تھا۔ یعنی چار اماموں کے طاہر اجساد کو اس مکان میں دفن کیا گیا جس کا تعلق بنی ہاشم سے تھا۔

"سمہودی" نے آگے چل کر مزید لکھا ہے کہ عباس بن عبدالمطلب کو فاطمہ بنت اسد کی قبر کے نزدیک جناب عقیل کے گھر میں واقع بنی ہاشم کے مقبروں میں ہی دفن کیا گیا تھا اس کے علاوہ موصوف نے سعید بن جبیر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس نے آنحضور (ص) کے فرزند ابراہیم

کی قبر کو محمد بن زید بن علیؑ کے مکان میں دیکھا ہے نیز بتایا جاتا ہے کہ سعد معاذ کو ابن افلح کے گھر میں دفن کیا گیا جو جنت البقیع ہی کے قریب تھا اور اس قبر پر گنبد اور عمارت بھی تعمیر کی گئی تھی

مختصر یہ کہ مذکورہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جنت البقیع کی زمین وقف نہیں تھی نیز ہمارے ائمہ طاہرین (ع) کے پاک اجساد کو ان کے اپنے گھر میں ہی سپردِ خاک کیا گیا ہے لہٰذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ درست ہے کہ اہلِ بیتؑ عصمت و طہارت سے تعلق رکھنے والی برگزیدہ ہستیوں کے روضہ ہائے مبارکہ کو "وقف" کا بہانہ تراش کر مسمار کر دیا جائے؟

آپ چند لمحوں کے لئے فرض کر لیں کہ بقیع کی سرزمین وقف ہے تو اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقف شدہ زمین کے بارے میں "واقف" نے اگر کوئی کیفیت بیان کی ہے تو کیا وہ تفصیل کسی کے پاس موجود ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا اس امر کا امکان نہیں پایا جاتا کہ وقف کنندہ نے اس زمین میں بزرگ ہستیوں کو دفن کرنے اور ان کی قبروں پر عمارت (یعنی مقبرہ/روضہ) تعمیر کرنے کی اجازت دے رکھی ہو؟ ہم اس بارے میں کیونکہ کچھ نہیں جانتے لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس ضمن میں صاحبانِ ایمان کے عمل کی صحت پر یقین رکھیں اور اس کے عمل کو موردِ الزام قرار نہ دیں۔ اور اگر ہم اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائیں تو پھر مقبروں کو منہدم کرنے کے عمل کا حرام ہونا بالکل واضح اور روشن ہے۔

بلھید کا لڑکا "قاضی" اور اس کے ہم خیال اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ وقف کا مسئلہ سوائے دلیل تراشی کے کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر وہ لوگ اس قسم کی دلیل نہ تراشتے تب بھی ان کی طرف سے اہلِ بیتؑ رسالت (ع) کے روضہ ہائے مبارکہ کو مسمار کرنا حتمی تھا کیونکہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا بلکہ ۱۲۲۱ ہجری میں بھی جب وہابیوں نے پہلی مرتبہ مدینہ منورہ پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ انہوں نے آثارِ رسالت کو برباد کیا تھا یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت عثمانی افواج نے انہیں سرزمین حجاز سے نکال باہر کرنے کے بعد ائمہ بقیع کے روضہ ہائے مبارکہ کو دوبارہ تعمیر کروا دیا تھا۔

باب ۳

قبور کی زیارت کتاب و سنّت کی روشنی میں

قبروں کی زیارت سے انسان کے دل و دماغ پر ایسے مثبت اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو انسان کی صحیح تربیت کا باعث ہیں۔ ہم اس باب میں اختصار کے ساتھ انہی اخلاقی اثرات کے بارے میں بات چیت کریں گے۔

اس وادیٔ خاموش کو دیکھ کر جہاں امیر ہوں یا غریب، طاقتور ہوں یا کمزور ایک ہی خاک اور ایک ہی حالت میں کفن پہنے کئی من وزنی مٹی کے نیچے پڑے ہوئے ہیں۔ انسان کا وجود لرز کر رہ جاتا ہے۔ انسان کے دل میں دنیا کے مال و زر کو اکٹھا کرنے کی خواہش ماند پڑ جاتی ہے اگر دیکھنے والا انسان چشم عبرت رکھتا ہو تو وہ قبور کو دیکھ کر درسِ عبرت حاصل کرتا ہے اور خود سے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ:

یہ عارضی زندگی جو صرف ساٹھ ستر یا اس سے کچھ زیادہ برسوں کی زندگی ہے اس کے بعد آخر کار انسان کو کئی من وزنی خاک کے نیچے جا کر ہی سونا ہے جہاں ایک دن اس کا پورا وجود

خاک بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے یہ عارضی زندگی اس قدر اہم نہیں ہے کہ اے انسان تو اسے خوبصورت بنانے کے لئے ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرے۔ خود پر اور دوسروں پر ظلم تک کرنے سے گریز نہ کرے۔ ہر ممکنہ طریقے سے حصولِ مال و دولت میں مشغول رہے یا یہ خواہش کرے کہ کسی نہ کسی طرح کسی مقام تک خود کو پہنچا سکے؟

یہ وہ وادیٔ خموشاں ہے جس کے مشاہدے کی وجہ سے پتھر سے پتھر دل بھی نرم ہو جاتا ہے بے پرواہ اور خوابِ غفلت میں محو انسان بھی ہوش میں آ جاتا ہے بے بصیرت انسان کو نگاہِ بصیرت حاصل ہوتی ہے اور انسان اپنی زندگی کے لائحۂ عمل کے بارے میں نظرِ ثانی کرنے کے علاوہ نئی فکر کا حامل بن جاتا ہے۔ انسان اپنی ان اہم ذمہ داریوں اور فرائض کے بارے میں غور و فکر کرنے لگتا ہے جو خداوند عزّ و جلّ کی طرف سے اسے اپنی ذاتی زندگی کے علاوہ دوسرے لوگوں کے سلسلے میں سونپی گئی ہیں چنانچہ وہ اپنی خود غرضیوں میں کمی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے جناب رسولِ اکرم (ص) نے فرمایا ہے کہ:

زُوْرُوا الْقُبُوْرَ فَاِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ

(دیکھیے صحیح ابن ماجہ۔ ج۔ ۱۔ باب ماجاء فی زیارۃ القبور۔ ص ۱۱۳)

ترجمہ:

قبور کی زیارت کرو کیونکہ ان کی زیارت سے تمہیں آخرت کی یاد آئے گی۔

کیونکہ "صحاح و سنن" کے مؤلفین نے کچھ ایسی احادیث بھی بیان کی ہیں جن میں سے بعض میں خاص وجوہات کی بنا پر قبروں کی زیارت سے جناب رسولِ اکرم (ص) نے منع فرمایا ہے جبکہ بعض میں آنحضور (ص) نے لوگوں کو قبروں پر جانے اور ان کی زیارت کرنے کی اجازت بھی دی ہے لہٰذا ہم ذیل میں کچھ احادیث کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں لیکن احادیث بیان کرنے سے قبل اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث جن کے ذریعے آنحضور (ص) نے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا ان میں ممانعت کی وجہ شاید یہ ہے کہ اسلام کے ظہور سے قبل مرنے والوں میں زیادہ تر مشرک اور بت پرست تھے اور اسلام نے مسلمانوں کو جہانِ شرک سے ہر قسم کا رشتہ توڑنے کی اہمیت بتانے کے لئے ایسا حکم دیا ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ منع فرمانے کی وجہ یہ

بات رہی ہو کہ وہ افراد جو نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے ایسے افراد کی قبروں پر نوحہ سرائی کرتے تھے جو حق پر نہ تھے نیز ایسے الفاظ زبان پر لاتے تھے جو اسلامی آداب کے منافی ہیں انہیں ایسا کرنے سے روکنے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہو۔ پھر جب اسلام کو فروغ حاصل ہو گیا اور ایمان کا پودا نشوونما حاصل کر چکا تو آنحضور (صلعم) نے قبروں کی زیارت کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو زیارتِ قبور کی اجازت فرمائی اور یہی وہ حقیقت ہے جسکا ذکر "صحاح اور سنن" کے مؤلفین نے جناب رسول خدا (ص) کے اس قول کو نقل کر کے واضح کیا ہے کہ:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الآخِرَةَ

(سنن ابن ماجہ۔ باب ما جاء فی زیارۃ القبور۔ ج ۱۔ ص ۱۱۴۔ طبع ہندوستان نیز صحیح ترمذی۔ ابواب الجنائز۔ ج ۳۔ ص ۲۷۴ جو کہ ابن العربی المالکی کی شرح کے ساتھ لبنان سے شائع کی گئی ہے۔

ترمذی، مذکورہ حدیث کو بریدہ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ،

حَدِيثُ بُرَيْدَةَ صَحِيحٌ وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ لَا يَرَوْنَ بِزِيَارَةِ الْقُبُورِ بَأْسًا وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ الْمُبَارَكِ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ وَإِسْحَاقَ۔

یعنی بریدہ کی بیان کردہ حدیث صحیح ہے اہلِ علم اس پر عمل کرتے ہیں اور ان کی نظر میں قبر کی زیارت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یہ قول ابن المبارک شافعی، احمد اور اسحٰق کا ہے اس کے علاوہ مذکورہ بالا حدیث کو صحیح مسلم۔ ج ۳۔ باب استئذان النبی (ص) ربہ عزوجل فی زیارۃ قبر امّہ ص۔ ۶۵ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔)

ترجمہ:

میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ مگر اب میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم قبروں کی زیارت کرو کیونکہ قبروں کی زیارت تمہیں دنیا سے بے اعتناء کر کے تمہیں

آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اکرم (ص) خود بھی (مذکورہ اعلان کے بعد) اپنی والدۂ ماجدہ کی قبر کی زیارت کرتے اور لوگوں سے فرمایا کرتے کہ قبور کی زیارت کیا کرو۔ کیونکہ ان کی زیارت سے آخرت یاد رہتی ہے۔

حدیث کا متن ملاحظہ فرمائیے!

زَارَ النَّبِيُّ (ص) قَبْرَ أُمِّهِ فَبَكَى وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهُ ...... إِسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا فَأَذِنَ لِي فَزُورُوا الْقُبُورَ فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ

(صحیح ابو داؤد ج ۲۔ کتاب الجنائز۔ باب زیارۃ القبور۔ ص ۱۹۵۔ صحیح مسلم ج ۴۔ کتاب الجنائز۔ باب زیارۃ القبور۔ ص ۷۳)

ترجمہ:

جناب رسول خدا (ص) نے اپنی والدۂ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی اور (اپنی والدہ کی قبر پر) روئے نیز انہیں بھی رلایا جو آپ کے ساتھ تھے ...... آنحضور (ص) نے فرمایا کہ میں نے اپنے خدا سے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت لی ہے پس تم بھی قبور کی زیارت کیا کرو کیونکہ ان کی زیارت تمہیں موت کی یاد دلائے گی۔

جناب عائشہ کہتی ہیں کہ جناب رسول خدا (ص) نے قبور کی زیارت کرنے کا اعلان فرمایا تھا متن حدیث یہ ہے کہ:

إِنَّ رَسُولَ اللهِ (ص) رَخَّصَ فِي زِيَارَةِ الْقُبُورِ

(صحیح ابن ماجہ۔ ج ۱۔ ص ۱۱۴) یاد رہے کہ یہ کہنا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا سے اجازت حاصل کی تاکہ اپنی والدۂ ماجدہ کی قبر کی زیارت کریں اس لئے ہے کہ احادیث بیان کرنے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدۂ ماجدہ (نعوذ باللہ) مشرکہ تھیں۔

صحیح مسلم ج ۳۔ باب استئذان النبی (ص) ربہ عزوجل فی زیارۃ قبر امّہ۔ ص ۶۵ پر کہا گیا ہے کہ یہ مسلّمہ امر ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ

والد اور آنحضور صلعم کے تمام آباؤ اجداد اہلِ توحید تھے وہ سب کے سب آئینِ حنیف پر ایمان رکھتے تھے اس بنا پر اس حدیث کے تمام حصّوں کو علمی اصولوں کے مطابق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سنن ابن داؤد ۔ ج ۔ ۲ کتاب الجنائز ص ۔ ۱۹۵ طبع مصر جو جامعۃ الازھر کے مشہور عالم دین شیخ احمد سعد کی تشریحات (حواشی) کے ساتھ شائع ہوئی اس کے علاوہ صحیح مسلم ۔ج ۔۴ کتاب الجنائز باب زیارۃ قبر المشرک ص ۔ ۶۵ پر بھی مذکورہ بالا دونوں احادیث مذکور ہیں:

جناب رسولِ خدا (ص) نے قبور کی زیارت کرنے کی اجازت فرمائی ہے۔

فَاَمَرَنِیْ رَبِّیْ اَنْ آتِیَ الْبَقِیْعَ فَاَسْتَغْفِرَ لَھُمْ. قُلْتُ کَیْفَ اَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟

قَالَ قُوْلِیْ: اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ یَرْحَمُ اللّٰہُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔

(سنن نسائی ج ۔ ۳ ۔ صفحہ ۷۶ اور صحیح مسلم ج ۔ ۳ ۔ ب ۔ مَا یُقَالُ عِنْدَ الدُّخُوْلِ الْقُبُوْرِ ۔ ص ۶۴)

ترجمہ

جناب رسولِ اکرم (ص) فرماتے ہیں کہ : مجھے میرے ربّ (اللہ) نے حکم دیا کہ بقیع جاؤں اور وہاں دفن افراد کے لئے) طلب مغفرت کروں (چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں) میں نے کہا کہ مجھے وہاں جا کر) کیا کہنا چاہیے ؟ تو آنحضور نے فرمایا : کہو : اس دیار کے مومنوں اور مسلمانوں پر سلام ہو۔ خداوند تعالےٰ ہم سے پہلے جانے والوں اور بعد میں جانے والوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے ہم بھی جلد ہی انشاء اللہ (اگر خدا نے چاہا تو) تم (اہل قبور) سے آملیں گے۔

کیونکہ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قبور کی زیارت کے موقع پر کس طرح دعا فرمایا کرتے تھے لہٰذا ذیل میں انہی ادعیہ میں سے کچھ دعائیں بیان کی جا رہی ہیں۔

سنن نسائی ج ۔ ۴ ۔ صفحہ ۷۶ پر مرقوم ہے کہ آنحضور (ص) زیارتِ قبور کے موقع پر فرمایا کرتے تھے :

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا وَاِیَّاکُمْ مُتَوَاعِدُوْنَ غَدًا

وَمُوَاکِلُوْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَھْلِ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ.

جبکہ مذکورہ کتاب کی جلد ۔ ۴ ۔ صفحہ ۷۷ ، پر ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے جس کا متن مذکورہ بالا حدیث سے قدرے مختلف ہے یہ حدیث اس طرح ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ وَنَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ اَسْاَلُ اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ لَنَا وَلَکُمْ

سنن ابو داؤد جلد ۔ ۲ ۔ صفحہ ۱۹۶ پر ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے جس کا متن یہ ہے:

صحیح مسلم ، جلد ۔ ۳ ۔ باب ۔ مایقال عند الدخول القبور ۔ ص ۔ ۶۳ ، حضرت عائشہ سے روایت نقل کی گئی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ حضرت رسول اکرم ۔ ص ۔ ہر شب کے آخری حصّے میں بقیع تشریف لے جاتے جہاں وہ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ وَاَتَاکُمْ مَا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُؤَجَّلُوْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَھْلِ الْبَقِیْعِ الْغَرْقَدِ۔

پھر اسی حدیث کے بعد مذکورہ کتاب میں ہی ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے جو یہ ہے:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) یُعَلِّمُھُمْ اِذَا خَرَجُوْا اِلَی الْمَقَابِرِ فَکَانَ قَائِلُھُمْ یَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ ۔ (یا) اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَلَاحِقُوْنَ بِکُمْ اَسْاَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ

عورتیں اور زیارتِ قبور

مذکورہ بالا بحث اور گفتگو کے بعد جو بات قابلِ ذکر ہے وہ عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کی اجازت کا مسئلہ ہے کیونکہ بعض روایات ایسی بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عورتوں کو زیارتِ قبور سے باز رہنے کی تلقین فرمائی ہے چنانچہ اس ضمن میں وہ افراد جو عورتوں کے لئے زیارتِ قبور جائز خیال نہیں کرتے ، درج ذیل حدیث بطور استدلال پیش کرتے ہیں ،

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ۔

(صحیح ابن ماجہ کتاب الجنائز۔ باب۔ ماجاء فی النھی عن الزیارۃ النساء القبور ج-۱-ص ۴۷۸-طبع اوّل، مصر)

ترجمہ:

جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قبور کی زیارت کرنے والی (اکثر) عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔

چنانچہ اس ضمن میں ہم اس امر کی وضاحت کردینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث کو عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کی مخالفت کے طور پر سند پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ

۱۔ اکثر علما کا خیال ہے کہ مذکورہ حدیث عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کے حرام ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس عمل کے مکروہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس کراہیت کی وجہ وہ خاص حالات ہیں جو اس زمانے (زمانہ صدرِ اسلام) میں موجود تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا حدیث کی تشریح بیان کرنے والوں میں "مفتاح الحاجۃ" کے مؤلف نے "صحیح ابن ماجہ" پر جو شرح لکھی ہے اس میں مؤلف نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

اَخْتَلَفُوْا فِی الْکَرَاھَۃِ ھَلْ ھِیَ کَرَاھَۃُ تَحْرِیْمٍ اَوْ تَنْزِیْہٍ ذَھَبَ الْاَکْثَرُ اِلَی الْجَوَازِ اِذَا اَمِنَتْ بِالْفِتْنَۃِ۔

(دیکھئے حواشی ابنِ ماجہ -ج-۱-ص ۱۱۴ -طبع ہندوستان)

اس حدیث میں جس "نہی" کا پہلو سامنے آتا ہے اس کے بارے میں علمائے اسلام کے اقوال دو طرح کے ہیں۔

۱۔ یہ نہی "حرام ہونے" کی دلیل ہے۔

۲۔ اس میں "کراھیت" کا پہلو پایا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی عورت کو یقین ہو کہ اگر اس نے قبور کی زیارت کی تو اس کے اس عمل سے "فتنہ" (غیر اسلامی عمل یا منکر امر) وجود میں نہیں آئے گا تو ایسی صورت میں وہ قبور کی زیارت کرسکتی ہے۔

۲۔ ہم اپنی گفتگو کے دوران بتاچکے ہیں کہ حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ جناب رسولِ

خدا (ص) نے زیارتِ قبور کی اجازت فرمائی تھی (گذشتہ صفحات پر حدیث نمبر-۴- ملاحظہ فرمائیں) لہٰذا اگر خواتین اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو پھر ضروری تھا کہ آنحضور (ص) اپنے حکم میں اس امر کی وضاحت فرماتے کہ یہ حکم صرف مردوں کے لئے ہے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس حدیث کو بیان کرنے والی خود خاتون ہیں اور جن لوگوں کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی ہے ان میں خواتین بھی شامل ہیں فطری امر ہے کہ حدیث کو سننے والا خواہ مرد ہو یا عورت یہ خیال کرسکتا ہے/سکتی ہے کہ یہ حدیث اسی کے لئے ہے۔

۳۔ بعض احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عائشہ کو زیارتِ قبور کا طریقہ تعلیم دیا اور حضرت عائشہ جناب رسولِ اکرم (ص) کی وفات کے بعد بھی اکثر قبروں کی زیارت کے لئے جایا کرتی تھیں۔

۴۔ ترمذی بیان کرتا ہے کہ جناب عائشہ کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر، جب حبشہ میں فوت ہوگئے تو ان کا جنازہ مکہ مکرمہ میں لایا گیا جہاں انہیں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عائشہ مدینے سے مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو وہاں وہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کے لئے گئیں اور اپنے بھائی کے غم میں ان کی قبر پر دو شعر پڑھنے کے بعد دعا بھی کی تھی۔

(دیکھئے صحیح ترمذی -ج -۴- کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی زیارۃ القبور ص-۲۷۵)

پھر صحیح ترمذی کی تشریح لکھنے والے امام "حافظ ابن العربی" (جن کی تاریخ پیدائش ۴۳۵ ھجری اور تاریخِ وفات ۵۴۳ ھجری بتائی جاتی ہے) انہوں نے بھی صحیح ترمذی پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں واضح کیا ہے کہ:

سچ تو یہ ہے کہ جناب رسولِ اکرم (ص) نے مردوں اور عورتوں دونوں کو قبور کی زیارت کرنے کی اجازت دی ہے۔ اگر کچھ لوگ عورتوں کے لئے زیارت کرنے کو "مکروہ" خیال کرتے ہیں تو اس کی وجہ قبور پر جاکر ہوش وحواس کھو بیٹھنا یا پھر مکمل طور پر اسلامی پردے کی شرط کو نظرانداز کردینا ہے۔

۵۔ صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی زیارۃ القبور۔ ص ۲۷۵۔ پر "بخاری" نے "انس" کے حوالے سے لکھا ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) نے ایک عورت کو اپنے [illegible] قبر کے [illegible]

جب روتے ہوئے دیکھا تو آنحضور (ص) نے فرمایا:۔ "تقویٰ کو اپنا پیشہ بناؤ اور صبر کرو۔" اس عورت نے جو جناب رسولِ اکرم (ص) کو نہیں پہچانتی تھی۔ جواب میں کہا کہ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تمہیں کیا علم کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔" بعد میں جب اس عورت کو بتایا گیا کہ تمہیں تقویٰ اور صبر کی تلقین فرمانے والے جناب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے تو یہ سن کر وہ عورت اپنے عزیز کی قبر چھوڑ کر فوراً آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسول اللہ میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے آپکو نہ پہچاننے کی وجہ سے آپکے حکم کی تعمیل نہ کی۔ چنانچہ اس عورت کو آنحضور (ص) نے مخاطب کرکے فرمایا کہ:

"مصیبت کی حالت میں انسان کے لئے اوّلین مطلوب صبر ہی ہے۔"

لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ اگر عورتوں کے لئے قبور کی زیارت مُطلقاً حرام ہوتی تو پھر کیا ضروری نہ تھا کہ جناب رسول خدا (ص) اس عورت کو قبر کے سرہانے بیٹھنے سے منع فرماتے؟ مگر مذکورہ بالا روایت کے الفاظ صاف واضح کر رہے ہیں کہ آنحضور صلعم نے عورت کو صرف اور صرف صبر کی تلقین فرمائی پھر جب وہ عورت جناب رسولِ اکرم (ص) کی خدمت میں حاضر ہوئی تب بھی آپؐ نے اسے یہی فرمایا کہ مصیبت کے عالم میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئیے

۷۔ اس کے علاوہ جناب رسولِ خدا (ص) کی صاحبزادی جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا ہر جمعۃ المبارک کے دن اپنے چچا جناب حمزہؓ کی قبر کی زیارت کے لئے جایا کرتی تھیں اور ان کی قبر کے نزدیک نماز پڑھنے کے علاوہ گریہ بھی کیا کرتی تھیں۔

(دیکھئے مستدرکِ حاکم۔ ج۔۱۔ ص ۳۷۷۔ اور کتاب وفا الوفا فی الاخبار دار المصطفیٰ ج۔۲۔ ص ۱۱۲)

۸۔ قرطبی کہتا ہے کہ جناب رسولِ اکرم (ص) نے زیارتِ قبور کے لئے جانے والی ہر عورت کی مذمّت نہیں فرمائی بلکہ آنحضور (ص) نے صرف ان عورتوں کی مذمّت کی ہے جو قبروں پر مسلسل زیارت کی غرض سے جایا کرتی ہیں کیونکہ حدیث میں "زوّاراتِ القبور" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور "زوّار" مبالغہ کا صیغہ ہے۔

(دیکھئے سنن ابن داؤد ج۔۲۔ ص ۱۹۶۔ جہاں "زائرات" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے)

حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجنے کی جو وجوہات ہیں ان میں شاید اہم ترین وجہ قبور کی بکثرت زیارت سے شوہر کی حق تلفی کا ارتکاب اور چیخ و پکار سے ہو کر منظرِ عام پر بے پردگی کا مظاہرہ ہے ورنہ اگر زیارت کرنے والی عورت ان امور کا خیال رکھے تو ایسی صورت میں اس کا عمل قابلِ اعتراض اور مذمّت نہیں ہوگا۔ کیونکہ موت کو یاد رکھنا جس طرح مردوں کے لئے ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی لازمی امر ہے قبور کی زیارت نہ صرف زائرین کو دنیا پرستی ترک کرکے آخرت کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہے بلکہ اس عمل سے انسان میں حرص وطمع کا جذبہ بھی ماند پڑ جاتا ہے نیز زیارتِ قبور وہ عمل ہے جس سے منوں مٹی کے نیچے ابدی نیند سونے والوں کو بھی بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں اسی لئے اسلامی احکامات کے مطابق قبور کی زیارت میں اہلِ قبور کے لئے فاتحہ خوانی کرنا اور اس کا ثواب اہل قبور کو ہدیہ کرنا لازمی امر قرار دیا گیا ہے اور یہ وہ بہترین تحفہ ہے جسے زندہ افراد اپنے ان عزیزوں کو پیش کر سکتے ہیں جو دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہوں۔

ابن ماجہ اپنی صحیح میں بیان کرتا ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) کا ارشاد ہے کہ:

اِقْرَؤُا یٰسٓ عَلٰی مَوْتَاکُمْ۔ (صحیح ابن ماجہ حدیث ۔ ۱۴۴۸۔ سنن ابی داؤد ج۔۳۔ ص ۴۸۹۔ باب القراۃ عند المیّت)

ترجمہ:

اپنے مرنے والوں کے لئے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرو۔

لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ بات کہ آخر اس مسئلہ میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کیونکر فرق کیا جاسکتا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک صنف کو ایک کام کرنے کی اجازت دی جائے اور دوسرے صنف کو اس کی اجازت نہ دی جائے؟ ایسا ہرگز ناممکن ہے ہاں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ عورتوں کے لئے کچھ خاص شرائط ضروری قرار دی جائیں اور یہ وہی شرائط ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

باب ۴

مذہبی شخصیتوں کی قبروں کی زیارت کے تعمیری اثرات

وہ قبریں جو دنیا کے خدا پرستوں، خصوصاً مسلمانوں کے پیشِ نظر اہمیت رکھتی ہیں غالباً ان ہستیوں کے مدفن ہیں جو معاشرے میں اہم ذمہ داری رکھتے تھے انہوں نے اپنی مذہبی ذمہ داری کو بوجہ احسن انجام دیا۔ ان شخصیتوں میں مندرجہ ذیل افراد خاص طور پر شامل ہیں۔

۱۔ مذہبی پیشوا اور انبیائے کرام جنہوں نے رسالت الٰہیہ کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا اور جنہوں نے اپنی جان مال اور عزیز و اقارب کے خون کا نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ بے انتہا مصائب برداشت کرنے کے بعد بھی عوام الناس کی ہدایت فرمائی۔

۲۔ وہ عظیم علماء اور دانشور جنہوں نے "شمع" کی مانند اپنے حلقۂ احباب کو علم کے نور سے روشن کیا۔ جنہوں نے اپنی جوانی کی امنگوں اور آرام و آسائش کو فراموش کر کے مدرسوں، علمی مراکز اور تحقیقاتی محافل کو ہمیشہ باقی رہنے والی طاقت کے ذریعے آباد کیا اور بنی نوع انسان کو علم و دانش کے گراں بہا خزانے سے نوازا۔ انسانوں کو کتابِ الٰہی جو کتابِ فطرت ہے

اس کے علاوہ زبانِ آفرینش سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے مذہبی، انسانی اور طبعی علوم کے اصول وضع کئے۔

۳۔ وہ لوگ جنہوں نے معاشرے پر ظلم، حق کشی اور بے جا نسل پرستی سے تنگ آ کر حقوقِ انسانی اور اجتماعی انصاف کے احیاء کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ستمگر اور خود غرض حاکم کے خلاف نبرد آزمائی کی اور جنہوں نے اپنے خون سے باطل پرست حاکموں کے ظلم کو ختم کیا یعنی شہیدانِ راہِ حق۔

معاشرے میں انقلاب اور ہر اصلاح کی ایک قدر و قیمت ہوا کرتی ہے نیز وہ انقلاب جس کا مقصد ظالموں کے محلات کو ڈھانا اور ان کے گھروں کو دیانا ہے اس انقلابِ مقدس کو بھی بے حد اہمیت و وقعت حاصل ہے۔ جہاد کرنے والے ان افراد کا خون جو یہ چاہتے ہیں کہ عدل و انصاف حریت اور آزادی ملک میں برقرار ہو بے حد قابلِ احترام ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی قبروں کی زیارت کے لئے لوگ جاتے ہیں اور ان کی قبروں پر اپنی محبت کے آنسوؤں کو بطور نذرانہ نچھاور کر کے ان کی اہم خدمات اور ناقابلِ فراموش قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھنے کا عہد کرتے ہیں قرآن حکیم کی کسی ایک سورۃ کی تلاوت کے ذریعے ان قابلِ احترام ہستیوں کے روح کی خوشنودی کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قربانیوں اور ان کے فضائل چاہے وہ اخلاقی نوعیت کے ہوں یا انسانی نوعیت کے انہیں شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے بعد نہ صرف انہیں اور ان کے مکتب کو زندہ اور یاد رکھنے کا باعث بنتے ہیں بلکہ عوام الناس کو ان کی راہ پر چلنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ نیز اس قسم کے افراد کی قبروں کی زیارت جہاں ان کی فداکاری اور جانثاری کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے وہاں موجودہ نئی نسل کو یہ پیغام دینا بھی ہے کہ اگر کوئی شخص حق و فضیلت کی راہ کا انتخاب کرے اور اپنے عقیدے کے دفاع اور حریت و آزادی کی راہ میں جان دے دے تو اس کا صلہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسے کسی زمانہ میں بھی بھلایا نہ جائے وہ زمانہ جس کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے اس زمانہ میں بھی پاک و صاف قلوب میں ان سے عشق و محبت کا جذبہ ابھرتا رہے۔

روایات سے پتا چلتا ہے کہ نفاق ڈالنے والوں کا سرغنہ "عبداللہ ابن ابی" جب مر گیا

تو خداوند عزّوجل نے جناب رسولِ خدا (ص) کو حکم دیا کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے نہ تو نماز پڑھیں اور نہ ہی اس قسم کے لوگوں (منافقین) کی قبروں پر (قرآن پڑھنے اور دعا کرنے کے لئے) جائیں۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ (سورہ توبہ - آیت - ۸۴)

ترجمہ:

اور (اے رسولؐ) ان (منافقوں) میں سے جو مر جائیں تو نہ کبھی کسی پر نماز (جنازہ) پڑھنا نہ اس کی قبر پہ (جا کر) کھڑے ہونا۔ ان لوگوں نے یقیناً خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا اور بدکاری کی حالت میں مر گئے۔

اس آیت میں منافقین کو تباہ کرنے اور ان کی گوشمالی دینے کے لئے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ:

۱۔ ان میں سے کسی کے جنازے پر ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

۲۔ ان کی قبروں پر نہ ٹھہریں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

یہاں پر جو یہ کہا گیا ہے کہ منافقین کے سلسلے میں مذکورہ بالا دو کام نہ کیے جائیں یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ جو غیر منافقین ہوں۔ ان کے لئے یہ کام بجالانا بالکل صحیح اور درست ہے۔

پھر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہاں اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ لاتقم علی قبرہٖ سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا مفہوم دفن کے موقع پر نماز پڑھنے سے ہے جو منافقین کے سلسلے میں جائز نہیں۔ جبکہ ان کے برعکس صاحبانِ ایمان کے لئے درست اور جائز ہے؟ یا پھر قبر پر کھڑے نہ ہونے کا حکم دفن کے علاوہ دوسرے مواقع کے بارے میں ہے؟

کچھ مفسرین نے مذکورہ آیت کو صرف دفن کے موقع سے متعلق سمجھا ہے جبکہ بعض مفسرین جیسے بیضاوی وغیرہ میں انہوں نے اس آیت کو وسیع معنیٰ میں دیکھا ہے اور اس کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ:

وَلَا تَقِفْ عَلٰی قَبْرِهٖ لِلدَّفْنِ اَوْ لِزِيَارَةٍ

(تفسیر بیضاوی ج ۳ - ص ۷۷)

یعنی حکم دیا گیا ہے کہ نہ تو اس قسم کے لوگوں کی قبروں پر دفن کے لئے اور نہ ہی زیارت کے لئے کھڑا ہوا جائے۔

اگر اس آیت کے مفہوم پر غور و فکر کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ آیت کا مفہوم بے حد وسیع ہے اور اس مفہوم میں دفن کے وقت یا دیگر مختلف مواقع پر نماز پڑھنا دونوں شامل ہیں۔

جناب رسولِ خدا (ص) کی قبرِ مبارک کی زیارت

مندرجہ بالا بحث سے عظیم القدر مذہبی شخصیتوں اور راہِ حق و فضیلت پر گامزن جانبازوں کے احترام کی اہمیت ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اس بحث سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مقدس ہستیوں کا احترام ان کے اس دنیا سے گزرنے کے بعد بھی اسی طرح کیا جانا چاہیے جس طرح ان کی زندگی میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ یعنی ضروری ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں کی حفاظت کی جائے ان کے یوم ولادت کے موقع پر محفلیں منعقد ہوں اور ان کے یوم وفات کو یوم غم قرار دیا جائے۔ ان ایام میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرائے جائیں جن میں مؤثر اور مفید تقاریر کے ذریعے عوام الناس کو ان کے مکتب سے آگاہ کرنے کے علاوہ انہیں یعنی عوام کو مستقبل میں ان کے مکتب کی حفاظت اور احترام کی دعوت دی جائے۔ یہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے مدفنوں کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی اہانت و توہین سے پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ ان کی قبروں کا احترام ان کے مکتب کی طرف دعوت دینے اور اس کے احترام کے مترادف ہے جب کہ ان کے مدفن اور آثار کی توہین و اہانت ان کی راہ و رسم کی توہین کرنے کے برابر ہے۔

عصرِ حاضر میں جب کوئی انسان جنت البقیع جاتا ہے اور وہاں اسلام کے پیشواؤں اور جناب رسولِ خدا (ص) کے عزیز صحابہ جنہوں نے دینِ اسلام کے فروغ کے لئے بے شمار قربانیاں دی تھیں ان کی قبروں کو ایسی حالت میں دیکھتا ہے جو ان قبور کی بے احترامی اور بے حرمتی کی عکاسی کرتی ہے تو انسان لرز کر رہ جاتا ہے اسے وہابیوں کی سنگ دلی پر سخت حیرت ہوتی ہے اس لئے کہ یہ لوگ جو ایک طرف خود کو آئینِ اسلام کا فروغ دینے والا سمجھتے ہیں اور منبروں پر جناب رسول

خدا (ص) کے صحابہ کرام اور دینی پیشواؤں کا نام نہایت عقیدت و احترام سے لیتے ہیں دوسری طرف اصحاب رسول خدا (ص) اور دینی پیشواؤں کی قبروں کا ذرہ برابر احترام کرنا بھی گوارا نہیں کرتے حد تو یہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے مدفنوں کو جانوروں سے گندہ کرنے سے بھی خوف محسوس نہیں کرتے، وہابی لفظ "شرک" اور مشرک کو بہانہ قرار دے کر اولیائے خدا کے ہر قسم کے احترام و تعظیم کو شرک قرار دیتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہابیوں کو اولیائے خدا سے ایک خاص قسم کی عداوت ہے اور ان کے ذرا سے بھی احترام پر ان کو پریشانی ہو جاتی ہے۔

بہر حال آئیے اب جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں اسلامی منطق کی روشنی میں بحث کی جائے۔

قرآنی ثبوت

قرآن مجید گناہ گار لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ جناب رسول خدا (ص) کی خدمت میں جائیں اور آنحضور صلعم سے درخواست کریں کہ وہ (ص) ان کے لئے خدا سے طلب مغفرت فرمائیں کیونکہ جناب رسول خدا (ص) کی دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاۤءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (سورۂ نساء آیت نمبر ۶۴)

ترجمہ:

اور (اے رسولؐ) جب ان لوگوں نے (نافرمانی کرکے) اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اگر تمہارے پاس چلے آتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول (تم) بھی ان کی مغفرت چاہتے تو بے شک وہ لوگ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

اگر صرف یہی ایک آیت ہوتی تو ہم کہتے کہ اس آیت کا تعلق اس زمانے سے ہے جب جناب رسول خدا (ص) حیات تھے لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر اس آیت کو ایک ایسے کلی حکم کے معنی میں لیا جاسکتا ہے جو صرف آنحضور (ص) کی حیات ظاہری سے متعلق نہ ہو۔ کیونکہ:

۱۔ قرآنی آیات نہ صرف اولیاء و انبیائے خدا بلکہ دوسرے افراد کے لئے بھی حیات برزخ

کی قائل ہیں اور اس دنیا میں ان کا تعارف دیکھنے اور سننے والوں کی حیثیت سے کیا جاتا ہے ہم اس قسم کی آیات کو "ارواح مقدسہ سے توسل" کے زیر عنوان بحث میں آگے چل کر پیش کریں گے۔

۲۔ اسلامی احادیث واضح طور پر یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ فرشتے لوگوں کے پیغام کو جناب ختمی مرتبت (ص) تک پہنچاتے ہیں یہ وہ احادیث ہیں جو صحاح ستہ میں بیان کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى اَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔

(سنن ابی داؤد۔ ج۔ ۱۔ کتاب الحج باب زیارۃ القبور صفحات ۴۷۰ - ۴۷۱)

ترجمہ:

رسول اکرم (ص) نے فرمایا: کوئی بھی مجھ پر سلام نہیں بھیج سکتا لیکن یہ کہ خداوند عزوجل اس کے سلام کو میری روح تک پہنچاتا ہے تاکہ میں اس کا جواب دوں۔

ایک اور حدیث کا متن یہ ہے کہ:

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ..... وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ۔

(التاج الجامع الاصول فی احادیث الرسول (ص) تالیف شیخ منصور علی ناصف۔ ج۔ ۲ ص۔ ۱۸۹)

ترجمہ

جناب رسول خدا (ص) کا ارشاد ہے کہ:

مجھ پر درود بھیجو کیونکہ تمہارے درود اور سلام مجھ تک پہنچتے ہیں چاہے تم کہیں بھی ہو۔

۳۔ اسلامی معاشرے نے اپنے آغاز سے ہی اس آیت کو ایک وسیع اور کلی معنی میں سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے یعنی جناب رسول خدا (ص) کی وفات سے اس آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جناب رسالتمآب (ص) کی وفات کے بعد عربوں کی بعض جماعتوں نے جن کے ذہن پاک اور صاف تھے اور جو محض زبانی بحث کو اہمیت دینے سے گریز کرتے تھے بارہا

جناب رسول خدا (ص) کی قبر مبارک کی زیارت کی اور مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کرنے کے بعد آنحضور (ص) سے درخواست فرمائی کہ آپ ؐ ان کے حق میں اللہ سے مغفرت چاہیں۔

"تقی الدین سبکی" نے اپنی کتاب "شفاء السقام" میں اور "سمہودی" نے اپنی کتاب "وفاء الوفا" میں ان دعاؤں کو بیان کیا ہے جن میں سے چند ایک کو ہم ذیل میں بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں شافعی مشائخ سے تعلق رکھنے والے "سفیان بن عنبر، عتبی" کے حوالے سے نقل کرتا ہے کہ میں جناب رسول خدا (ص) کی قبر مبارک کے قریب کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک عرب نے روضۂ رسول (ص) میں داخل ہونے کے بعد کہا :۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِعْتُ اللّٰهَ يَقُوْلُ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا وَقَدْ جِئْتُكَ مُسْتَغْفِرًا مِنْ ذَنْبِىْ مُسْتَشْفِعًا بِكَ اِلٰى رَبِّىْ

یہ الفاظ کہنے کے بعد وہ عرب زار و قطار رونے لگا اور اس نے یہ اشعار پڑھے۔

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمہ

فطاب من طیبھن القاع والاکم

نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ

فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم

(دیکھئے کتاب ، وفاء الوفا ج - ۴ - ص ۱۳۶۱)

"سمہودی" اسی ضمن میں حضرت علی علیہ السلام کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ :۔

جناب رسولِ خدا (ص) کی وفات کو ابھی تین دن گزرے تھے کہ ایک عرب آنحضور (ص) کی قبر مبارک پر آیا اور اس نے خود کو جناب رسولِ خدا (ص) کی قبر مبارک پر گرا دیا۔ آنحضور (ص) کی قبر کی خاک کو اپنے سر پر ڈالا اور پھر کہنے لگا۔

اے رسولِ خدا (ص) آپ نے کہا اور ہم نے سُنا ۔ جو کچھ آپ نے خدا سے حاصل کیا اسے ہم نے آپ ؐ سے حاصل کیا۔ دیگر آیات میں سے یہ آیت بھی خدا ہی کی طرف سے نازل

ہوئی کہ :۔ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا .... لہٰذا میں جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے آپ کی خدمت میں اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ ؐ میرے لئے اللہ سے مغفرت فرمائیں۔

بہر حال یہ وہ حقائق ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ وہ مقام و مرتبہ جو مذکورہ بالا آیہ کریمہ کے ذریعے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا ہے وہ صرف جنابِ رسولِ خدا (ص) کی حیاتِ ظاہری کے لئے ہی نہ تھا بلکہ یہ وہ مقام و عظمت ہے جو آنحضور (ص) کو ان کی وفات کے بعد سے لے کر تا قیامت حاصل رہے گی۔

پھر اصولی اور عملی طور پر مسلمان اُن آیاتِ کریمہ کو جو حضورؐ کے احترام کرنے سے متعلق ہیں انہیں صرف آپ کی حیاتِ طیبہ تک ہی محدود نہیں کرتے بلکہ ان پر عمل آنحضور (ص) کی وفات کے بعد بھی اسی طرح لازمی سمجھتے ہیں جس طرح جناب رسولِ خدا (ص) کی ظاہری حیات میں ضروری تھا اور اس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسن بن علی علیہما السلام کے دفن کے موقع پر جب کچھ لوگوں نے امام (ع) کی قبر پر رونا شروع کر دیا تو اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے اس عمل کو دیکھ کر یہ آیۂ کریمہ تلاوت فرمائی کہ :۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِىِّ

(سورۂ حجرات - آیت - ۲)

ترجمہ : اے صاحبانِ ایمان ! اپنی آواز کو نبی (ص) کی آواز پر بلند نہ ہونے دو۔

اور اس موقع پر کسی نے حتیٰ کہ بنو امیہ نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ آیت تو صرف جناب رسولِ خدا (ص) کی ظاہری حیاتِ مبارکہ اور ان کے احترام کے لئے ہے۔ مزید برآں عصر حاضر میں بھی وہابیوں نے ہی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر پر یہی آیت لکھ رکھی ہے تاکہ اس آیت کریمہ کے ذریعے زیارتِ قبرِ رسول (ص) کرنے والوں کو اس امر کی طرف متوجہ کریں کہ وہ اس مقدس مقام پر اپنی آواز کم رکھیں اور صحیح انداز سے بات کریں۔ لہٰذا اگر ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پھر ماننا پڑتا ہے کہ مذکورہ بالا آیۂ کریمہ کو وسیع معنیٰ دیئے جا سکتے ہیں اور آج بھی آنحضور (ص) سے اپنی مغفرت کے لئے درخواست کی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ زیر بحث آیۂ کریمہ دو امور کو بیان کرتی ہے

۱۔ جناب رسولِ خدا (ص) کی وفات کے بعد بھی آنحضورؐ کی خدمت میں جایا جا سکتا ہے اور آپؐ سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ ہم انسانوں کے بارے میں خدا سے مغفرت طلب فرمائیں (ہم انشاء اللہ اولیائے خدا سے توسل" کے باب میں اس ضمن میں تفصیلی بحث پیش کریں گے)

۲۔ اس آیۂ کریمہ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) کی قبر مبارک کی زیارت شرعی طور پر جائز ہے کیونکہ زیارت کی حقیقت سوائے اس کے کہ زیارت کرنے والا صاحب قبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ نہیں لہٰذا اگر یہ جائز ہے کہ ہم جناب رسول اکرم (ص) کی قبر پر جائیں اور آپؐ سے درخواست کریں کہ آپؐ خدا سے ہمارے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے زیارت قبرِ رسولؐ کے ذریعے دو امور انجام دیئے ہیں۔

الف: جناب رسولِ خدا (ص) سے درخواست کی کہ وہ ہمارے حق میں اللہ سے طلبِ مغفرت فرمائیں۔

ب: جناب رسولِ اکرم (ص) کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے باتیں کیں کیونکہ حقیقی زیارت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نیز زیارت قبرِ رسول (ص) کا مقصد بھی یہی ہے۔

دوسرا ثبوت

مختلف ادوار میں اس حکم خداوندی پر مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع خود اسکی صداقت و استواری کا روشن ترین ثبوت ہے پھر مسلمانوں کی طرف سے زیارت قبر رسول (ص) میں گہری دلچسپی اس کے جواز کی سب سے بڑی دلیل ہے اگر حدیث، فقہ، اخلاق، تاریخ اور خاص طور پر مناسک حج سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا جائے تو پھر حقیقت امر بالکل واضح اور روشن ہے

مرحوم علامہ امینی نے ۴۲ اسلامی حوالوں کے ساتھ جناب رسول خدا (ص) کے روضۂ مبارک کی زیارت کے مستحب ہونے کو ثابت کیا ہے موصوف نے اپنی کتاب "الغدیر" کی جلد ۵ صـ ۱۰۶ تا ۱۲۹ میں ۴۲ حوالوں کی عبارت کو پوری ذمہ داری سے بیان کیا ہے۔ ہم ذیل میں ان کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم نے زیر بحث موضوع کا ذکر ان کتب میں موجود پایا ہے

۱۔ شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام :۔ مصنف تقی الدین سبکی شافعی (متوفی ۷۵۶)

مصنف نے زیارتِ قبر رسول (ص) سے متعلق نصوص کے علاوہ علمائے کرام کے دلائل کا ایک حصہ بھی بیان کیا ہے۔

۲۔ وفاء الوفاء :۔ مصنف سمہودی (متوفی ۹۱۱)؛ مصنف نے اپنی کتاب میں ان نصوص اور علمائے کے دلائل کو بیان کیلئے جن میں اس عمل کے مستحب ہونے کی تائید کی گئی ہے۔

۳۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، اس کتاب کو اہلسنت کے چار علماء نے لکھا ہے اور اس کتاب میں اہلسنت کے چاروں اماموں کے افکار و نظریات بیان کئے گئے ہیں اور یہی وہ نظریات اور عقائد ہیں جن کی اہل سنت پیروی کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ :۔ زیارۃ قبر النبی افضل المندوبات وورد فیہا احادیث:

(دیکھئے مذکورہ کتاب ج ۔ ۱ ۔ ص ۔ ۵۹۰)

اب ہم ذیل میں ان احادیث کو بیان کریں گے جو محدثینِ اسلام نے اسی موضوع کے ضمن میں نقل کی ہیں۔

زیارتِ قبرِ رسولؐ کے بارے میں منقول احادیث

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں اہل تسنن سے تعلق رکھنے والے محدثین کی نقل کردہ احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ ہمیں ان کی اسناد اور روایات کے بارے میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہر فرقے کے علماء نے اپنی کتب میں ان احادیث کو نقل کیا ہے جو اس امر کی دلیل ہیں کہ زیارتِ قبرِ رسول (ص)، ان کے مسلمہ اعمال کا جزو رہی ہے ان تمام احادیث کا ذکر گفتگو کو طولانی بنانے کا موجب بنے گا۔ اس لئے ہم صرف چند احادیث پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ: قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ. مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ.

ترجمہ :

عبداللہ ابن عمر سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا رسولِ خدا (ص) کا ارشاد ہے کہ جس شخص

نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہے۔

مندرجہ بالا حدیث الفقہ علی المذاہب الاربعۃ نامی کتاب کی جلد ۱ - ص - ۵۹۰ پہ مندرج ہے اور اہل سنت کے چہارگانہ مذاہب کے بعض علماء نے اسی کے مطابق فتویٰ صادر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس حدیث کے مستند ہونے کے لئے دیکھئے کتاب وفاء الوفا - ج - ۴ - ص ۱۳۳۶۔

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ ایک ایسی حدیث جسکو ۱۵۰ ہجری سے آج تک متواتر علماء اپنی کتابوں میں بیان کرتے چلے آرہے ہیں کسی صورت میں بھی غلط اور غیر مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی (متوفی ۷۵۶)، نے اپنی گرانقدر کتاب شفاء السقام (یہاں بہترین کتابوں میں سے ہے جو اہل سنت نے زیارت قبر رسول (ص) کے بارے میں ابن تیمیہ کے فتویٰ کو حرام قرار دینے کے سلسلے میں لکھی ہیں) کے صفحہ ۲ تا ۱۱ میں اس حدیث پر بحث و تبصرہ کر کے اس حدیث کے صحیح اور مستند ہونے کو ثابت کیا ہے۔

مَنْ جَآءَنِیْ زَائِرًا لَا تَحْمِلُہٗ اِلَّا زِیَارَتِیْ کَانَ حَقًّا عَلَیَّ اَنْ اَکُوْنَ لَہٗ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔

جو شخص صرف اور صرف میری زیارت کے ارادے سے میرے پاس آتا ہے اس کے بارے میں میرے لئے یہی مناسب ہے کہ میں قیامت کے دن اس کا شفیع بنوں۔

مذکورہ حدیث کو ۱۶ محدثین نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے اور تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام" (ص - ۱ - ۱۳) میں اس حدیث کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے اس کے علاوہ دیکھئے وفاء الوفا - ج - ۴ - ص ۱۳۴۰۔

مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِیْ بَعْدَ وَفَاتِیْ کَانَ کَمَنْ زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ

جس شخص نے حج کرنے کے بعد میری قبر کی زیارت کی اس کی مثال اسی شخص کی ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

مندرجہ بالا حدیث کو ۲۵ محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے اور تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام" (ص ۱۲ تا ۱۶) میں مذکورہ حدیث کے مستند ہونے کے بارے میں دلائل بیان کئے ہیں اس کے علاوہ دیکھئے کتاب وفاء الوفا - ج - ۴ ص ۱۳۴۰)

مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ

اگر کوئی خانہ خدا کی زیارت (حج) کرے اور میری زیارت کو نہ آئے گویا اس نے مجھ پہ ظلم کیا ہے۔

اس حدیث کو ۹ محدثین نے بیان کیا ہے دیکھئے وفاء الوفا - ج - ۴ - صفحہ ۱۳۴۲

مَنْ زَارَ قَبْرِیْ (اَوْ مَنْ زَارَنِیْ) کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا (وَشَہِیْدًا)

جو کوئی میری قبر کی زیارت کرے گا میں اس کا شفیع (گواہ) بنوں گا۔

مذکورہ بالا حدیث کو گیارہ محدثین نے بیان کیا ہے اور ان محدثین میں سے بعض کا تعلق تیسری صدی ہجری سے ہے دیکھئے "وفاء الوفا" ج ۴ - ص ۱۳۴۳۔

مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ

جو کوئی میری موت کے بعد میری زیارت کرے گا اسکی مثال اسی شخص کی ہوگی جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

اس حدیث کو ۱۳ محدثین نے بیان کیا ہے دیکھئے وفاء الوفا - ج - ۴ - ص ۱۳۴۷

مندرجہ بالا احادیث ان بے شمار احادیث میں سے ہیں جن میں لوگوں کو زیارت قبر رسولؐ کو اہمیت دینے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ صاحب الغدیر کے مطابق اس قسم کی احادیث کی تعداد ۲۲ ہے جبکہ سمہودی نے اپنی کتاب وفاء الوفاء ج - ۴ (ص ۱۳۳۶ تا ۱۳۴۸) میں ۱۷ احادیث بیان کی ہیں اور ان کے مستند ہونے کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

جناب رسول اکرم (ص) نے مسلمانوں کو اپنی قبر کی زیارت کرنے کی جو دعوت دی ہے اس کی وجہ وہ مادی اور معنوی (روحانی) فوائد ہیں جو اسلام کی عظیم القدر ہستیوں کی زیارت قبور میں مضمر ہوتے ہیں۔ کیا زیارت قبر رسول (ص) کا یہ فائدہ کم ہے کہ اس کے ذریعے مسلمان آئین اسلام کے مرکز نشر و اشاعت سے روشناس ہونے کے بعد اس مرکز میں رونما ہونیوالے تاریخی حوادث و واقعات کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں سے صحیح علوم و احادیث کی معرفت حاصل کر کے انہیں دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

زیارت قبور کو حرام قرار دینے کے لئے وہابیوں کے دلائل

وہابی طبقہ اگرچہ زیارت قبر رسول (ص) کو جائز تسلیم کرتا ہے تاہم کسی بھی صورت دوسروں کی قبروں کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتا۔ محمد بن عبدالوہاب کے بیٹے نے "الهدیة السنیه" نامی رسائل کے دوسرے رسالہ میں لکھا ہے کہ:

تُسَنُّ زِیَارَةُ النَّبِیِّ اِلَّا اَنَّهُ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا لِزِیَارَةِ الْمَسْجِدِ وَالصَّلٰوةِ فِیْهِ۔

حضور (ص) کی زیارت مستحب ہے لیکن مسجد کی زیارت اور وہاں نماز پڑھنے کے مقصد کے علاوہ سفر جائز نہیں ہے۔

زیارت کے حرام ہونے کے سلسلے میں ان کی جو سب سے اہم ترین دلیل ہے وہ ذیل میں پیش کی جانے والی وہ حدیث ہے جسے صحاح ستہ میں نقل کیا گیا ہے اور جس کا راوی ابو ہریرہ ہے ابو ہریرہ کہتا ہے کہ جناب رسول خدا (ص) نے فرمایا۔

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِیْ هٰذَا وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

سوائے تین مسجدوں کے جن میں ایک میری مسجد (مسجد نبوی) دوسری مسجد الحرام اور تیسری مسجد الاقصٰی شامل ہیں سفر کرنا درست نہیں ہے۔

اس مندرجہ بالا حدیث کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ:

اِنَّمَا یُسَافِرُ اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ۔ مَسْجِدِ الْکَعْبَةِ وَمَسْجِدِیْ وَمَسْجِدِ اِیْلِیَا۔

اس کے علاوہ اسی حدیث کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ:

تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ .....

(دیکھئے "صحیح مسلم" جس میں مذکورہ حدیث تینوں صورتوں میں موجود ہے ج ۴ کتاب الحج باب لا تشد الرحال۔ ص ۱۲۶ اس کے علاوہ سنن ابی داؤد۔ ج ۱۔ کتاب الحج ص ۴۶۹ پر بھی ان کا ذکر موجود ہے)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ حدیث کو "صحاح" میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز ہم اس امر پر بھی بحث نہیں کرتے کہ اس حدیث کا راوی ابوہریرہ ہے۔ لیکن پھر بھی اہم مسئلہ اس حدیث کے مفہوم کا ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ: لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد تو اس صورت میں یہ مسلم امر ہے کہ لفظ اِلّا استثنا ہے اور اِلّا کو لفظ استثنا تسلیم کرنے کے بعد لازمی امر ہے کہ مستثنیٰ منہ کو بھی تلاش کیا جائے اس لئے کہ استثنا کے ساتھ مستثنیٰ منہ کا ہونا ضروری ہے اب کیونکہ مستثنیٰ منہ الفاظ میں نہیں ہے لہٰذا یقینی طور پر وہ معنیٰ میں ہوگا یعنی مستثنیٰ منہ مقدر (چھپا ہوا) ہے چنانچہ قرائن پر عمل کرنے سے پہلے مستثنیٰ منہ کو جن دو صورتوں میں اس کے معنیٰ میں دیکھا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلٰی مَسْجِدٍ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلٰی مَکَانٍ مِنَ الْاَمْکِنَةِ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ

یعنی حدیث کے مفہوم کو سمجھنے کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ مندرجہ بالا معنی میں سے کس معنی کو منتخب کرتے ہیں؛

اگر حدیث کے معنیٰ پہلے مفروضے کی بنیاد پر ہوں تو اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی بھی مسجد کے لئے سفر کرنا جائز نہیں سوائے ان مساجد کے اور یہ مطلب ہرگز مراد نہیں لیا جائے گا کہ کسی بھی جگہ کے لئے خواہ وہ مسجد نہ ہو "شدّ رحال" یعنی سفر کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی انبیائے خدا، ائمہ طاہرین اور دیگر نیک اور صالح افراد کی زیارت کے لئے سفر کرے تو اس کے سفر پر کسی طرح بھی مذکورہ حدیث کا اطلاق اس لئے نہیں ہوگا کیونکہ حدیث میں موضوع بحث مساجد کے لئے سفر کرنے کا ارادہ ہے اور تمام مساجد میں سے مذکورہ بالا تین مساجد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جب کہ مشاہدہ کے لئے ارادہ سفر اس بحث کے موضوع سے خارج ہے۔

اس کے برعکس اگر حدیث کا مفہوم دوسرے مفروضے کی بنیاد پر اخذ کیا گیا تو اس ...

ہیں سوائے مذکورہ تین مساجد کے باقی تمام معنوی سفر ممنوع قرار پائیں گے یعنی خواہ یہ سفر مسجد کی زیارت کے لئے ہو یا پھر مقدس مقامات کی زیارت کے سلسلے میں لیکن قرینے کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ مندرجہ ذیل دلائل کی بناء پر حدیث کا مفہوم پہلے مفروضے کے مطابق ہی صحیح ہے۔

ا۔ تین مساجد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور کیونکہ مستثنیٰ، مستثنیٰ متصل ہے لہٰذا مستثنیٰ منہ لفظ مساجد ہوگا نہ جگہ۔

مثال کے طور پر اگر کوئی یہ کہے کہ "مَاجَآءَنِیْ اِلَّا زَیْدٌ" تو مستثنیٰ منہ لفظ انسان یا اس کی مانند دوسرا لفظ ہی ہوگا جیسے قوم نہ یہ کہ وسیع معنیٰ کے پیش نظر کوئی بھی چیز یا کوئی بھی موجود خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان)

اگر اس حدیث کے ذریعے تمام معنوی سفروں کو ممنوع قرار دیا گیا تو یہ مفہوم صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ اعمالِ حج میں انسان عرفات، مشعر اور منیٰ کے لئے بھی قصدِ سفر کرتا ہے لہٰذا اگر کوئی بھی مذہبی سفر سوائے مذکورہ تین مساجد کے سفر کے جائز نہیں تو پھر مذکورہ بالا تین مقامات یعنی عرفات مشعر اور منیٰ کے لئے سفر کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

۲۔ خدا کی راہ میں جہاد، تعلیم، صلہ رحم اور والدین کی زیارت کے لئے سفر ان سفروں میں شامل ہیں جن کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث بکثرت موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (سورۃ التوبہ آیت ۱۲۰)

ترجمہ:

ان میں سے ہر گروہ کی ایک جماعت (اپنے گھروں سے) کیوں نہیں نکلتی تاکہ علم دین حاصل کرے اور جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو ان کو (عذاب آخرت سے) ڈرائے تاکہ یہ لوگ ڈریں۔

اسی وجہ سے عظیم محققین نے مذکورہ حدیث کی بالکل اسی طرح تشریح کی ہے جس طرح ہم بیان

کر چکے ہیں امام غزالی اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں لکھتے ہیں کہ:

سفر کی دوسری قسم یہ ہے کہ عبادت کے لئے سفر کیا جائے جیسے جہاد فی سبیل اللہ۔ حج۔ انبیائے خدا، اولیائے خدا، صحابہ کرام اور تابعین وغیرہ کی قبروں کی زیارت کے لئے سفر ہے۔ کوئی بھی ایسی شخصیت جس کی زیارت اس کی زندگی میں باعثِ رحمت و برکت ہو۔ اس کی وفات کے بعد بھی اس کی قبر کی زیارت متبرک ہوگی اور ان مقاصد کے لئے تشدّ الرحال یعنی سفر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے نیز یہ امر اس حدیث کے منافی بھی نہیں ہے جس کی روشنی میں سوائے تین مساجد کے لئے سفر کے علاوہ دیگر سفروں کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

پھر مذکورہ حدیث جس کا موضوع مساجد ہیں اس میں مساجد کی یکساں فضیلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کی زیارت کے لئے سفر جائز نہیں ورنہ اگر مساجد کو مدِ نظر نہ رکھتے ہوئے صرف یہ دیکھا جائے کہ وہاں انبیاء اور اولیائے خدا کی قبور ہیں۔ تب بھی انبیاء اور اولیائے خدا کی زیارت کی فضیلت بالکل عیاں ہے کیونکہ وہ بلند و ارفع درجات و مراتب کے حامل ہوتے ہیں۔

(دیکھئے احیاء العلوم۔ باب آداب السفر۔ ج۔۲۔ ص ۲۴۷۔ طبع بیروت اور الفتاوی الکبریٰ۔ ج۔۲۔ ص ۲۴)

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) نے اگر یہ فرمایا ہے کہ مذکورہ بالا تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کے لئے سفر نہیں کرنا چاہیے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کے لئے "شدِ رحال" حرام ہے۔ بلکہ اس قولِ رسول (ص) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تین مساجد کے علاوہ دیگر تمام مساجد چاہے وہ دنیا کی سب سے بڑی مساجد میں شامل ہوں یا کسی محلے کی سادہ قسم کی مساجد کیونکہ فضیلت و ثواب کے اعتبار سے ہم مرتبہ ہیں اس لئے انسان کو ان کی زیارت کے لئے سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر ظاہری بات ہے کہ یہ جاننے کے بعد کہ تمام مساجد فضیلت اور ثواب کے اعتبار سے یکساں ہیں اپنے قریب واقع مسجد کو نظر انداز کر کے دور دراز کے علاقے میں موجود مسجد کی زیارت کے لئے جانا اور سفر کی تکلیفیں برداشت کرنا سوائے ایک غیر دانشمندانہ عمل کے کچھ

بھی نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر کوئی ایسا کرے تو گویا اس نے فعلِ حرام انجام دیا ہے اور اس کا یہ سفر "گناہ" کہلائے گا...... اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ثبوت صحاح اور سنن کے مصنفین نے یہ روایت بیان کر کے دیا ہے کہ، جناب رسولِ خدا (ص) اور ان کے اصحاب ہر ہفتے کے دن مسجد قبا جایا کرتے تھے اور وہاں نماز پڑھتے تھے۔

صحیح بخاری میں بیان کیا گیا ہے کہ

إِنَّ النَّبِيَّ (ص) كَانَ يَأْتِي مَسْجِدَ قُبَا كُلَّ سَبْتٍ مَاشِيًا أَوْ رَاكِبًا وَ اَنَّ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ۔

ترجمہ:

بتحقیق جناب رسول خدا (ص) ہر ہفتے کے دن "مسجد قبا" تشریف لے جایا کرتے تھے کبھی پیادہ اور کبھی کسی سواری کے ذریعے نیز ابن عمر بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

(دیکھئے صحیح بخاری ج۔۲۔ص ۷۶، شرح مسلم النووی ج۔۹۔ص ۱۶۹۔ ۱۷۱ یا پھر سنن نسائی سیوطی۔ج ۲۔ص۔۳۷)

قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ آخر کس اصول کی بنا پر کسی ایک مسجد میں نماز بجا لانے کی خاطر کئے جانے والے سفر کو حرام یا ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ مسجد میں نماز پڑھنے اور اس مقصد کے لئے سفر کو مستحب کہا گیا ہے؟

باب ۵

اولیائے خدا کی قبور پر نماز اور دُعا

وہابیوں کی کتابوں میں جن مسائل پر خاص طور سے بحث کی گئی ہے ان میں سے ایک اہم ترین موضوع اولیائے خدا کی قبور پر نماز پڑھنے اور دعا کرنے کے علاوہ چراغ جلانے کا مسئلہ بھی ہے۔

وہابی مکتب کا بانی اپنے "زیارۃ القبور" نامی مقالے میں لکھتا ہے کہ:

لَمْ يَذْكُرْ اَحَدٌ مِنْ اَئِمَّةِ السَّلَفِ اَنَّ الصَّلَاةَ عِنْدَ الْقُبُوْرِ وَ فِيْ مَشَاهِدِهَا مُسْتَحَبَّةٌ وَلَا اَنَّ الصَّلٰوةَ وَالدُّعَاءَ هُنَاكَ اَفْضَلُ بَلِ اتَّفَقُوْا كُلُّهُمْ عَلٰى اَنَّ الصَّلٰوةَ فِي الْمَسَاجِدِ وَالْبُيُوْتِ اَفْضَلُ مِنْهَا عِنْدَ قُبُوْرِ الْاَوْلِيَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ۔ (زیارۃ القبور۔ ص [illegible]

ترجمہ:

گذشتہ پیشواؤں (ائمہ) میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اولیاء اللہ کی قبروں کے نزدیک نماز پڑھنا مستحب ہے اور نہ ہی یہ کہا گیا ہے کہ دوسرے مقامات کی نسبت وہاں نماز پڑھنا اور دعا کرنا افضل ہے بلکہ سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اولیائے خدا اور صالحین کی قبور کے نزدیک نماز پڑھنے کی نسبت مساجد اور گھروں میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے

مدینہ منورہ کے علماء سے منسوب جواب میں کہا گیا ہے کہ:

اَمَّا التَّوَجُّهُ اِلٰی حُجْرَةِ النَّبِيِّ (ص) عِنْدَ الدُّعَآءِ فَالْاَوْلٰی مَنْعُهٗ كَمَا هُوَ مَعْرُوْفٌ مِنْ مُعْتَبَرَاتِ كُتُبِ الْمَذْهَبِ وَلِاَنَّ اَفْضَلَ الْجِهَاتِ جِهَةُ الْقِبْلَةِ۔

ترجمہ:

دعا کے وقت جناب رسولِ خدا (ص) کی قبر کی طرف توجہ کرنے کے بارے میں بہتر یہی ہے کہ اجتناب کیا جائے کیونکہ معتبر کتب میں اس کی ممانعت موجود ہے اس کے علاوہ قبلہ بہترین سمت ہے۔

مذکورہ بالا مسئلہ جو ماضی میں صرف ممانعت کی حد تک محدود تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ ممانعت کے مرحلے سے "شرک" کے مرحلے میں داخل ہو گیا اور آج اس قسم کے عمل کو "شرک" سے تعبیر کیا جا رہا ہے جبکہ اس عمل کو انجام دینے والا "مشرک" کہلاتا ہے۔

یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ جب بھی کوئی شخص قبروں کے نزدیک صاحبِ قبر کے لئے نماز پڑھے گا اور اس کی پرستش کرے گا یا یہ کہ اس قبر کو اپنا قبلہ قرار دے گا تو ایسی صورت میں یہ مسلّم امر ہے کہ وہ شرک کا مرتکب ہو گا لیکن پوری دنیا میں کوئی بھی مسلمان انبیاء اور اولیائے خدا کی قبور کے نزدیک ایسا کام نہیں کرتا یعنی نہ وہ صاحبِ قبر کی عبادت کرتا ہے اور نہ ہی اس کو اپنا قبلہ قرار دیتا ہے اس لئے اس عمل کو شرک کہنا سوائے ایک تہمت کے اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں میں اولیائے خدا کی قبروں کے نزدیک نماز پڑھنے یا دعا کرنے کی وجہ اس جگہ کے تقدس کے سوا

کچھ بھی نہیں کیونکہ ایک محبوبِ خدا وہاں سپردِ خاک کیا گیا ہے اس لئے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس محبوبِ خدا کی وجہ سے اس جگہ کو عظمت حاصل ہو گئی ہے اور وہاں نماز و دعا کا زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے ضمن میں قابلِ توجہ یہ سوال بھی ہے کہ آیا ایسی جگہ جو کسی بزرگ اور صالح شخصیت کا مدفن ہے اسے خاص فضیلت اور عظمت حاصل ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اگر قرآن و سنت کی روشنی میں ایسی جگہ کی فضیلت و عظمت ثابت ہو جائے تو پھر اس مقام پر نمازوں کی فضیلت کا تسلیم کرنا بھی طبعی امر ہو گا پھر اگر اس مقام کی فضیلت ثابت نہ ہو سکے تو کیا یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ فضیلت ثابت نہ ہونے کے باوجود دوسرے مقامات کی طرح قبور کے نزدیک نماز و دعا جائز اور مشروع عمل ہے چاہے یہ عمل باعثِ فضیلت نہ ہو؟ لہٰذا اس ضمن میں ہم سب سے پہلے اس بات کا جائزہ پیش کرتے ہیں کہ اولیائے خدا کے مدفن خاص عظمت و فضیلت رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کا ثبوت قرآن و سنت میں موجود ہے یا نہیں؟ اور یہ وہ سوال ہے جس کا جواب درج ذیل قرآنی آیات کے بارے میں غور و فکر کے بعد بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اصحابِ کہف کے مدفن کے بارے میں موحدین کے نظریہ کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ہم ان کے مدفن کو مسجد بنائیں گے۔

(سورۂ کہف - آیت - ۲۱)

اصحابِ کہف کے مدفن کو مسجد قرار دینے کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ وہ لوگ (جو مسجد بنانا چاہتے تھے) اپنے مذہبی فرائض کو وہاں انجام دیں یعنی وہاں نماز پڑھیں اور اللہ کے حضور دعائیں مانگیں۔

زمخشری اپنی کتاب "کشاف" میں اس آیہ کی تشریح بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

يُصَلِّيْ فِيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ وَيَتَبَرَّكُوْنَ بِمَكَانِهِمْ جبکہ نیشاپوری نے بھی اپنی تفسیر میں اس آیہ کی تفسیر میں یہی (مذکورہ) جملہ تحریر کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان وہاں نماز پڑھتے ہیں اور اس جگہ کو اپنے لئے باعثِ برکت خیال کرتے ہوئے طلبِ رحمت و برکت

کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں مذکورہ بالا قول کو موحدین کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے نیز ان کے اس عمل پر کوئی تنقید بھی نہیں کی گئی حالانکہ اگر یہ عمل صحیح نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ قرآن میں اس پر نکتہ چینی کی جاتی اور اسے حرام بتایا جاتا لیکن قرآن مجید میں موحدین کے قول کو سادگی سے بیان کرنے کے بعد اس کے بارے میں کسی قسم کی تنقید نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ نگاہ قدرت میں یہ عمل حرام نہیں ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں خانۂ خدا کے زائرین کو حکم دیا گیا کہ وہ مقام ابراہیمی پر نماز پڑھیں۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:۔ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى

یعنی مقام ابراہیم (ع)

کو اپنے لئے جائے نماز قرار دو۔ (سورہ بقرہ - آیت ۱۲۵)

مذکورہ بالا آیت کو کسی بھی (عربی جاننے والے) شخص کے سامنے پڑھیے تو وہ اس کا وہی مفہوم سمجھے گا جو ہم نے اس کے ترجمہ میں بیان کیا ہے لہٰذا قابلِ غور طلب یہ امر ہے کہ آخر کیوں مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ قرار دینے کا حکم ہوا؟ تو ظاہر سی بات ہے کہ حضرت ابراہیم جس جگہ نماز پڑھا کرتے تھے اس جگہ کو حضرت ابراہیم (ع) کی وجہ سے فضیلت و احترام حاصل ہو گیا۔ اور اسی احترام کی بنا پر ہی خدا نے مسلمانوں کو اس جگہ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سوچنے کی بات ہے کہ وہ جگہ جہاں ابراہیم (ع) کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے اگر قابلِ احترام بن سکتی ہے تو پھر آخر کیونکر راہِ حق میں شہید ہونے والے اور مقدس شخصیتوں کے مدفن باعث فضیلت و احترام نہیں ہو سکتے؟ کیا فطری تقاضے کے مطابق ان مقامات کو زیادہ فضیلت حاصل نہیں ہونی چاہیے؟ کیا ایسی شخصیتوں کے مدفن کے نزدیک دعا کرنے سے دعا کی قبولیت کے زیادہ امکانات نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ مذکورہ بالا آیت حضرت ابراہیم (ع) کے بارے میں نازل ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مسلمہ ہے اس آیہ کو کلی حکم یا قانون کی حیثیت حاصل ہے۔

دوانقی نے امام مالک (اہل سنت کے معروف امام) سے مسجد النبی (ص) میں بات چیت کے

دوران سوال کیا کہ، دعا کے وقت قبلہ کی جانب کھڑے ہو کر دعا کروں یا رسولِ خدا (ص) کے روضہ مبارکہ کی جانب رخ کر کے دعا کروں؟ تو امام مالک نے جواب دیا: آخر وہ کونسی چیز مانع ہے جس کی وجہ سے تم جناب رسولِ مقبول (ص) کی قبرِ مطہر کی طرف رخ نہ کرو جبکہ آنحضورؐ تم سب کے لئے ہی نہیں بلکہ حضرتِ آدم کے لئے بھی ذریعہ شفاعت ہیں بہتر یہی ہے کہ تم جناب رسولِ خداؐ کی قبر کی جانب رخ کرو اور آپؐ کو اپنا شفیع بناؤ نیز آنحضور سے اپنی شفاعت کے لئے درخواست کرو۔ (دیکھئے وفاء الوفاء فی اخبار دار المصطفےٰ ج -۴ - ص ۱۳۷۶)

مذکورہ بالا بات چیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) کی قبر کے نزدیک دعا کرنے میں کوئی برائی یا قباحت نہیں ہے نیز دوانقی کی مدینۂ رسولؐ کے ایک عالم سے بات چیت جہاں ایک کی دوسرے پر برتری بیان کرتی ہے وہاں اس امر کا اظہار بھی ہے کہ امام مالک کی نظر میں قبرِ رسول (ص) کی طرف رخ کرنا ایسا ہی ہے جیسے قبلہ کی طرف رخ کرنا ہے۔

۳۔ معراج کا واقعہ اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کیونکہ واقعۂ معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ جب جناب رسولِ خدا (ص) نے طیبہ، طور سینا اور بیت لحم میں نماز ادا فرمائی تھی تو حضرت جبرئیل نے آنحضور (ص) سے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ جانتے ہیں وہ کون سا مقام تھا جہاں آپؐ نے نماز پڑھی تھی؟ پھر آنحضور (ص) کو بتایا تھا کہ وہ حضرت عیسےٰ (ع) کی جائے ولادت تھی جہاں آپ نے نماز پڑھی! (دیکھئے الخصائص الکبریٰ - تالیف عبدالرحمٰن السیوطی)

یہ حدیث بھی اس امر کے ثبوت کیلئے کافی ہے کہ ان مقامات پر نماز پڑھی جا سکتی ہے جہاں انبیائے خدا کے اجسام مس ہوئے ہوں کیونکہ یہ مقام خاص فضیلت کے حامل ہیں ورنہ حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت پر نماز پڑھنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔

۴۔ حضرت ہاجرہ اور حضرتِ اسمٰعیل کا خدا کی راہ میں صبر اور جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کرنے کا نتیجہ ہی ہے کہ وہ مقام جہاں آپ کے قدم مبارک مس ہوئے انہیں عبادت کی جگہ قرار دے دیا گیا یعنی صفا اور مروہ کا علاقہ (دیکھئے کتاب الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر الانام - مصنف ابن القیم - ص ۲۲۸)

اسی حقیقت کو ابن تیمیہ کے شاگرد نے بھی بیان کیا ہے

جہاں ان دونوں (جناب ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل) نے اپنے قدم رکھے، خدا کی راہ میں مصیبتیں اٹھائیں اور صبر کیا، اس قدر مبارک بن سکتی ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اس جگہ خدا کی عبادت کریں تو پھر ان انبیائے خدا کے مدفن کیونکر متبرک نہ ہوں گے جنہوں نے معاشرے کی اصلاح کی خاطر اس جوہرِ صبر کا مظاہرہ پیش کیا جس کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے:

۵۔ محدثینِ اسلام نے جناب رسولِ خدا (ص) کے حوالے سے نقل کی جانے والی درجِ ذیل حدیث کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ:

خداوندِ عالم نے یہود و نصاریٰ کی اس وجہ سے مذمت کی ہے کہ انہوں نے انبیاءؑ کی قبور کو مساجد بنا دیا تھا۔

لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ

(سنن نسائی ۔ ج ۲ ۔ ص ۹۶ طبع بیروت)

اور اسی مفہوم کو بطورِ استدلال پیش کرتے ہوئے وہابیوں نے اولیائے کرام کی قبور کے نزدیک نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دیا ہے لیکن اس ضمن میں جو امر غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ جناب عائشہ جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۵۰ سال تک اسی حجرے میں نماز پڑھی جو جناب رسولِ اکرم (ص) کا مدفن تھا لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قبور کے نزدیک نماز پڑھنا جائز نہیں تو پھر ام المومنینؓ کیونکر ایک طویل عرصے تک اسی حجرہ میں جو رسولِ اکرم (ص) کا مدفن بھی ہے نماز پڑھتی رہیں؟

۶۔ اگر جناب رسولِ اکرم (ص) کے مدفن کے لئے کسی خاص فضیلت و عظمت کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسولِ خدا (ص) کے مدفن کو فضیلت حاصل نہ تھی تو آخر شیخین نے کیونکر قبرِ رسول (ص) کے نزدیک خود کو دفن کرنے پر اصرار کیا؟ کیوں امام حسن علیہ السلام نے یہ وصیت فرمائی کہ ان کے جسمِ مطہر کو ان کے نانا (ص) کی قبر کے پہلو میں دفن کیا جائے اور اگر اس سلسلے میں دشمن رکاوٹ بنیں تو پھر انہیں جنت البقیع میں سپردِ خاک کیا جائے؟

مذکورہ بالا دلائل اور زمانۂ صدرِ اسلام سے مسلمانوں میں پائی جانے والی یہ روایت و رسم کہ جہاں کہیں بھی خدا کے نیک بندے اور راہِ حق پر گامزن صاحبانِ عظمت و فضیلت سپردِ خاک ہوتے

ہیں وہاں نماز و دعا پڑھتے ہیں اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ان مقامات پر نماز و دعا زیادہ سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں۔

●

بہرحال یہ فرض کر لینے کے بعد کہ وہ مقامات جہاں اللہ کے نیک اور صالح بندے یا اولیائے کرام دفن ہیں انہیں قرآن و سنت کی روشنی میں کوئی فضیلت حاصل نہیں دوسرا سوال جو باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر ان مقامات پر نماز پڑھنا کیونکر ناجائز ہے؟ آخر کس وجہ سے ان مقامات کو اسلام کے اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جس کے مطابق زمین کے کسی بھی حصے پر اللہ کی عبادت کی جا سکتی ہے۔

ہم اپنی گذشتہ گفتگو کے دوران اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ مذکورہ حدیث جس میں یہود و نصاریٰ کی طرف سے انبیاءؑ کی قبور کو مساجد میں تبدیل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا مقصد کیا ہے اور اس قسم کی احادیث کا قبور کے نزدیک نماز و دعا کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ اولیائے خدا کی قبور پر چراغ جلانے کا مسئلہ جس کے بارے میں وہابیوں نے سختی سے منع کیا ہے وہ بھی کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے اور اس کے بارے میں وہابیوں کے عقیدے کو درست تسلیم نہ کرنے کی کافی گنجائش پائی جاتی ہے اس لئے کہ انہوں نے قبور پر چراغ جلانے کے عمل کو ناجائز قرار دینے کے لئے جو دلیل پیش کی ہے وہ وہی حدیث ہے جسے سنن نسائی نے ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسولِ خدا (ص) نے قبور کی زیارت کرنے والی عورتوں اور ان لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جنہوں نے قبور کو مسجد بنا دیا اور وہاں چراغ جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ گذشتہ گفتگو کے دوران یہ بات بھی ثابت کی جا چکی ہے کہ اس قسم کی احادیث میں بعض وجوہات کی بنا پر مذکورہ اعمال کی کراہت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ اعمال کو حرام قرار دیا گیا ہے تب بھی انہیں خاص حالات اور وجوہات کی بنا پر حرام سمجھا جائے گا۔ یعنی اس صورت میں جبکہ قبروں پر چراغ جلانا رقم کے نقصان اور غیر علم

اقوام کی رسوم کی پیروی کے حکم میں آئے اسے حرام سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اس کے برعکس چراغ جلانے کا مقصد قرآنِ حکیم کی تلاوت، دعا اور نماز کا پڑھنا ہو تو اس صورت میں یہ عمل یعنی چراغ جلانا۔ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی کی روشن مثال ہو گا اور اسے ممنوع یا حرام نہیں سمجھا جائے گا۔

○

باب ۶

اولیائے خدا سے توسّل

درگاہِ الٰہی کے محبوب بندوں سے توسّل ایک ایسا عمل ہے جس کا رواج دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہے اور جس دن جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے شریعتِ اسلامی کی تبلیغ کا آغاز کیا تھا اسی دن سے اسلامی احادیث کے ذریعے ان کی مشروعیت کا بھی اعلان ہو گیا۔

یہ آٹھویں ہجری کا واقعہ ہے کہ ابن تیمیہ نے مذکورہ حقیقت کا انکار کیا اور پھر اس کے دو سو سال بعد محمد بن عبدالوہاب نے شدت کے ساتھ اسی داستان کا اعادہ کیا اور اولیائے کرام سے توسّل کو غیر مشروع اور بدعت قرار دیا۔ اس عمل کو اولیائے کرام کی عبادت کہہ کر اسے شرک سے تعبیر کیا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت شرک اور حرام ہے انشاء اللہ ہم آگے چل کر عبادت کے مفہوم کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے اور بتائیں گے کہ

کس طرح کوئی عمل، عبادت، کہلا سکتا ہے اور کب (انداز عبادت بدل جانے سے) وہی عمل شرک بن جاتا ہے لیکن اس وقت اس مسئلے کی وضاحت پیش کرنے کی بجائے ہم صرف اس امر کی یاددہانی کرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اولیائے خدا سے توسل کی دو صورتیں ہیں :

۱۔ اولیائے خدا کی ذات سے توسل

جسے ان الفاظ کے ساتھ ظاہر کیا جاتا ہے کہ :

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ (ص) اَنْ تَقْضِيَ حَاجَتِيْ

(یعنی بار الہا ! میں تیرے نبی (حضرت) محمد (ص) کو وسیلہ قرار دیتا ہوں تاکہ تو میری حاجت روا فرمائے)

۲۔ بارگاہِ الہی میں اولیا کے مقام اور اللہ سے ان کے تقرب سے توسل :

جیسے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ (ص) وَحُرْمَتِهٖ وَحَقِّهٖ اَنْ تَقْضِيَ حَاجَتِيْ۔

(خداوندا ! میں (حضرت) محمد (ص) کے اس مقام و احترام اور حق کو وسیلہ قرار دے کر تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میری حاجت روا فرما جو انہیں تیری درگاہ میں حاصل ہے)

وہابیوں نے مذکورہ بالا دونوں صورتوں کو حرام قرار دیا ہے حالانکہ احادیث اور "سیرۃ المسلمین" وہابیوں کے نظریے کے خلاف ان کی مشروعیت اور جواز کو بیان کرتی ہیں اور اولیائے کرام سے توسل کو دونوں طریقوں میں قابلِ قبول قرار دیتی ہیں۔

ذیل میں کچھ احادیث اور اس کے بعد "سیرۃ المسلمین" کو بیان کیا جا رہا ہے تاکہ مندرجہ ذیل دو دلائل کی روشنی میں اولیائے کرام سے توسل کے بدعت اور غیر مشروع ہونے کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے ہاں البتہ یہ مسئلہ کہ اولیائے خدا سے توسل ان کی عبادت اور پرستش کرنے کے مترادف ہے اسے ہم "مفہوم عبادت" کے زیر عنوان باب میں تفصیل سے بیان کریں گے جو ہماری بحث کا اہم ترین حصہ ہے۔

احادیث

احادیث اور تاریخ کی کتب میں ایسی بے شمار احادیث موجود ہیں جو اولیائے کرام سے توسل اور بلند و ارفع مقام پر فائز نیک بندوں کو وسیلہ قرار دینے کو صحیح ثابت کرتی ہیں ہم ذیل میں ان احادیث میں سے چند احادیث ہی کو بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

پہلی حدیث :

راوی عثمان بن حنیف کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ :

ایک نابینا جس نے جناب رسولِ خدا (ص) سے توسل کے نتیجے میں اپنی بینائی حاصل کی :

اِنَّ رَجُلاً ضَرِيْرًا اَتَى اِلَى النَّبِيِّ (ص) فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يُعَافِيَنِيْ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ وَاِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ وَهُوَ خَيْرٌ قَالَ فَادْعُهُ۔ فَاَمَرَهُ اَنْ يَتَوَضَّاءَ فَيُحْسِنَ وُضُوْءَهُ وَيُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ وَيَدْعُوَ بِهٰذَا الدُّعَاءِ :

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ (ص) نَبِيِّ الرَّحْمَةِ۔ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ لِتُقْضٰى۔ اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِيَّ قَالَ ابْنُ حَنِيْفٍ فَوَاللّٰهِ مَا تَفَرَّقْنَا وَطَالَ بِنَا الْحَدِيْثُ حَتّٰى دَخَلَ عَلَيْنَا كَاَنْ لَمْ يَكُنْ بِهٖ ضُرٌّ۔

ترجمہ : ایک نابینا آدمی جناب رسولِ خدا (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ (یا رسول اللہ) خداوندِ عالم سے میری عافیت کے لئے دعا فرمائیں۔ جناب رسول خدا (ص) نے فرمایا : اگر چاہو تو دعا کرو اور اگر چاہو تو صبر کرو کیونکہ صبر بہتر ہے۔ نابینا نے کہا۔ حضور میرے لئے دعا فرمایئے۔ چنانچہ جناب رسولِ خدا نے اسے حکم دیا کہ وہ وضو کرے اور اپنے وضو میں بہت احتیاط برتے اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھے اور اس طرح دعا کرے کہ :

بار الہا ! میں تیرے حضور التجا کر رہا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہو رہا ہوں تیرے نبی محمد (ص) کے وسیلے سے جو نبی رحمت ہیں۔ اے (اللہ کے رسول) محمد (ص) میں آپ کے وسیلے سے اپنے

رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ میری حاجت روا فرمائے۔

بارالہا: ان کی (رسول اللہ کی) شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

ابن حنیف کہتا ہے کہ ابھی ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ہم نے اسے (نابینا کو) دیکھا وہ ہمارے پاس آیا اس طرح کہ وہ دیکھ سکتا ہے (معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ نابینا تھا)

مذکورہ حدیث مستند ہے!

مذکورہ بالا حدیث کی صحت اور اس پر یقین کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے یہاں تک کہ وہابیوں کے پیشوا "ابن تیمیہ" نے بھی اس کو مستند قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث میں ذکر شدہ شخص "ابوجعفر" سے مراد "ابوجعفر خطمی" ہے اور یہ وہ شخص ہے جسے قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ (یاد رہے کہ مسند احمد میں لفظ "خطمی" ابوجعفر کی صفت کے طور پر آیا ہے جبکہ "ابن ماجہ" کی صحیح میں صرف ابوجعفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

عصرِ حاضر کا وہابی مصنف "رفاعی" جس کی کوشش رہی ہے کہ توسل کے بارے میں احادیث کو ناقابلِ اعتماد بنا سکے مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

لَا شَكَّ اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ صَحِيْحٌ وَمَشْهُوْرٌ وَقَدْ ثَبَتَ فِيْهِ

بِلَا شَكٍّ وَلَا رَيْبَ اِرْتَدَّ اَبْصَرُ الْاَعْمٰى بِدُعَاءِ رَسُوْلِ اللهِ (ص)

(دیکھئے التوصل الی حقیقۃ التوسل - ص ۱۵۸)

ترجمہ!

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حدیث بالکل صحیح اور مشہور ہے اور اس امر میں بھی شک نہیں کہ ایک نابینا شخص جناب رسول اکرم (ص) کی بتائی ہوئی دعا کے نتیجہ میں اپنی بینائی دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

"رفاعی" اپنی کتاب "التوصل ....." میں مزید لکھتا ہے کہ مذکورہ حدیث کو نسائی، بیہقی، طبرانی، ترمذی اور حاکم نے بھی اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔ ہاں البتہ مؤخر الذکر دو افراد نے "واشفعنی" کی بجائے "اللھم شفعہ فیہ" کے لفظ بیان کئے ہیں۔

"زینی دحلان" اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" میں لکھتا ہے کہ:

مذکورہ حدیث کو بخاری نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ابن ماجہ اور حاکم نے اپنی مستدرک میں اور جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "جامع" میں بیان کیا ہے۔

کیونکہ ہم بھی مذکورہ حدیث کو مندرجہ ذیل کتب کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں اس لئے اس حدیث کے مستند ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۔ سنن ابن ماجہ، جلد ۱، ص ۴۴۱، ناشر داراحیاء الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاء۔ تحقیق محمد فواد عبدالباقی حدیث نمبر ۱۳۸۵

ابن ماجہ نے "ابواسحاق" کے حوالے سے لکھا ہے کہ: هٰذَا الْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ

اس کے بعد موصوف مزید لکھتا ہے کہ، اس حدیث کو ترمذی نے اپنی کتاب "ابواب الادعیہ" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ، هٰذَا الْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ

۲۔ مسند احمد حنبل، ج ۴، ص ۱۳۸، عثمان بن حنیف کی مسند، ناشر المکتب الاسلامی بیروت ... حنبل نے مذکورہ حدیث کو درج ذیل ۳ حوالوں سے بیان کیا ہے۔

۳۔ مستدرک حاکم، جلد ۱، ص ۳۱۳، آفسٹ طبع، حیدرآباد میں حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ، هٰذَا الْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ یعنی یہ حدیث صحیح ہے شیخین کی شرائط پر اور اس حدیث کو اخراج "کی صورت میں بیان نہیں کیا گیا۔

۴۔ الجامع الصغیر، مصنف نے مذکورہ حدیث کو سیوطی، ترمذی اور مستدرک حاکم کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

۵۔ تلخیص مستدرک، مصنف ذہبی۔ وفات ۸۴۸ھ یہ کتاب مستدرک کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئی ہے۔

۶۔ التاج، جلد ۱، ص ۲۸۶۔ اس کتاب میں سوائے ابنِ ماجہ کے باقی پانچوں صحاح کی احادیث کو ایک ساتھ جمع کیا گیا ہے۔

الف: اگر آپ اس حدیث کو عربی زبان جاننے والے کے سامنے پیش کریں تو وہ شخص جو زبان عربی سے واقفیت رکھتا ہے اور اس کا دل ودماغ وہابیوں کی طرف سے "توسل" کے مسئلے" پر حم

التی سیدھی باتیں کی جاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوا ہے اس سے جب آپ یہ سوال کریں گے کہ وہ دعا جسے پڑھنے کی جناب رسول خدا (ص) نے نابینا شخص کو تاکید فرمائی تھی اس میں آنحضور (ص) نے اسے کیا کہنے اور کرنے کا حکم دیا تھا؛ تو یہ شخص آپ کو یہی جواب دے گا کہ جناب رسولِ اکرم (ص) نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ جناب رسالتمآب (ص) کو وسیلہ قرار دے کر اللہ سے حاجت روائی کی درخواست کرے اس لئے کہ درج ذیل جملے سے اس مفہوم کے علاوہ کوئی اور مطلب اخذ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ ...

یعنی بارالٰہا! میں تیرے حضور التجا کر رہا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوا ہوں۔ تیرے نبیؑ حضرت محمد (ص) کے وسیلے سے

لفظ "نبیک" پہلے دو جملوں سے متعلق ہے جن میں ایک "اسئلک" ہے اور دوسرا "اتوجہ الیک"۔

گویا یہ کہنا زیادہ بجا معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا (ص) کے وسیلے سے دعا کرنے والا جناب رسولِ مقبول (ص) کے حکم پر اس کے (اللہ کے) حضور دعا بھی کر رہا ہے اور اس کی طرف متوجہ بھی ہو رہا ہے سیاق و سباق پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں "نبی" سے مراد وجودِ ذی جود حضرت ختمی مرتبت (ص) ہے اور یہ تصور غلط ہے کہ "نبی" سے مراد نبی کی دعا ہے اس لئے کہ اگر یہاں یہ مفہوم مراد لیا جائے کہ دعا کرنے والا نبیؐ کی دعا کی وجہ سے اللہ کی طرف متوجہ ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دعا یا التجا خود جناب رسول اکرم (ص) کی تھی اور یہ چیز نہ صرف لفظ "دعا" کے مفہوم کے منافی ہے بلکہ اصولِ بلاغت کے خلاف بھی ہے لہٰذا جو کوئی لفظ "دعا" کو حذف کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کے اس عمل کا محرک ذواتِ مقدسہ سے "توسل" کے عقیدے کو صحیح نہ سمجھنا ہے اس لئے کہ یہی وہ عقیدہ ہے جو اسے لفظ "دعا" کے مفہوم کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کوئی تاویل نکالنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ یہ کہہ سکے کہ یہاں رسولِ اکرم (ص) کی دعا کی طرف متوجہ ہونا مقصود ہے اور اس توجہ کا جناب رسول اکرم (ص) کی ذات سے کوئی تعلق نہیں اور یہ امر دلیل ہے کہ اشخاص کی دعا کی طرف متوجہ ہونا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

ب: جناب رسول مقبول (ص) نے نابینا شخص کو جس دعا کی تعلیم دی تھی اس میں "نبیک" کے

لفظ کی "محمد نبی الرحمۃ" کے جملے سے تعریف کر کے اس حقیقت کو مکمل طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ دعا کرنے والا خدا کے رسول (ص) کو وسیلہ قرار دے کر اللہ سے سوال بھی کر رہا ہے اور اس کی طرف متوجہ بھی ہو رہا ہے۔

ج: "یَا مُحَمَّدُ" انی اتوجہ بک الی ربی" کا جملہ اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ دعا کرنے والا حضرتِ محمد مصطفےٰ (ص) کی ذات کو، اللہ کے حضور دعا اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا سبب (ذریعہ) قرار دے رہا ہے نہ یہ کہ آنحضور (ص) کی دعا اسے یہ عمل بجا لانے کا محرک بنی ہے۔

د- وَاستفعہ فی: کے معنی یہ ہیں کہ

بارالٰہا! انہیں (حضرت محمد (ص) کو) میرا شفیع قرار دے اور ان کی شفاعت کو میرے حق میں قبول فرما: مختصر یہ کہ دعا کی عبارت پر جو بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دعا میں جناب رسولِ اکرم (ص) کی ذات والا صفات کو وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور یہاں "نبی کی دعا" کو سبب قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ مَمْشَايَ
هٰذَا فَاِنِّيْ لَمْ اَخْرُجْ اَشَرًا وَّلَا بَطَرًا وَّلَا رِيَاءً وَّلَا سُمْعَةً وَ
خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ فَاَسْئَلُكَ اَنْ تُعِيْذَنِيْ
مِنَ النَّارِ وَاَنْ تَغْفِرَلِيْ ذُنُوْبِيْ اِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ.

حدیث نمبر ۲

دعا کرنے والوں کے حق کو وسیلہ قرار دینا

"عطیہ عوفی" ابو سعید خدری کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ جناب رسولِ اکرم (ص) نے فرمایا جو کوئی بھی نماز کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے اور درجِ ذیل دعا پڑھتا ہے اس پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور ایک ہزار فرشتے اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں (اقبل اللہ بوجھہ و استغفرلہ الف ملک) دیکھئے حافظ محمد بن ابی عبداللہ بن ماجہ قزوینی کی "صحیح"

جوکہ صحاح ستہ میں سے ہے۔ جلد۔۱۔ مساجد۔ ص ۲۶۱ - ۲۶۲ طبع مصر اور دیکھئے مسند امام احمد ابن حنبل جلد۔۳۔ حدیث نمبر ۲۱)

بارالٰہا: میں تجھ سے تیرے نیک بندوں کے طفیل اور اس وقت و مقام کی حرمت کی خاطر سوال کر رہا ہوں جس میں میں تیری طرف بڑھا۔ میں تیری نافرمانی، عیش و آرام اور ریا و فریب کاری کے لئے اپنے گھر سے نہیں نکلا بلکہ میں نے خود کو تیرے غیظ و غضب سے بچانے اور تیری خوشنودی (رضا) کے حصول کے لئے گھر سے باہر قدم نکالا ہے بس میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ کو آتش جہنم سے محفوظ رکھ اور میرے گناہوں کو معاف فرما۔ کیونکہ گناہوں کو تیرے سوا اور کوئی معاف نہیں کرتا۔

کیونکہ مذکورہ بالا حدیث ان واضح احادیث میں سے ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ انسان خدا سے اپنی حاجت کو پورا کرانے کی دعا کے وقت اور اس کے نیک بندوں کے مقام و منزلت کو واسطہ قرار دے سکتا ہے لہٰذا مذکورہ حدیث ہی ہمارے مقصد اور مطلب کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

حدیث نمبر۔۳

آنحضور (ص) کے حق کو وسیلہ قرار دینا

حضرت آدمؑ نے خدا کی نافرمانی (وہ حکم جو وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ —— والی آیت یعنی سورۂ بقرہ کی آیت۔ ۳۵ میں آیا ہے کسی مولا کا حکم نہیں ہے بلکہ یہ وہ حکم الٰہی ہے جسے حکم ارشادی کہا جاتا ہے یعنی اس میں نصیحت کا پہلو پایا جاتا ہے اس قسم کے حکم کی مخالفت کرنا عتاب کا سبب نہیں بنتا بلکہ اس کا نتیجہ اس عمل کی وجہ سے رونما ہونے والے اثرات سے دوچار ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ نزلہ کی صورت میں اچار نہ کھائے اور مریض ڈاکٹر کی نصیحت پر عمل نہیں کرتا تو اس کا نتیجہ صرف بیماری کی شدت کے علاوہ کچھ اور نہ ہوگا۔ قرآن میں کچھ آیات ثابت کرتی ہیں کہ خدا نے اگر کچھ چیزوں (امور) کے نہ کرنے کا حکم دیا ہے تو ان میں ارشادی یا رہنمائی کا پہلو ہے

دیکھئے آیات ۱۱۸، ۱۱۹ سورہ طٰہٰ اور کتاب قرآن کی مشکل آیات کی تفسیر۔ ص ۳۰، ۴۲۔ لہٰذا حضرت آدم سے جو ترک اولیٰ ہوا وہ بھی مذکورہ نوعیت کا تھا باعث عذاب گناہ نہ تھا) کرنے کے بعد ان ہی الفاظ میں جو خدا نے ان کو سکھائے تھے۔ توبہ کی چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

ترجمہ: (سورہ بقرہ۔ آیت۔ ۳۷)

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کیلئے) چند الفاظ سیکھے پس خدا نے (ان الفاظ کی برکت سے) آدم کی توبہ قبول کرلی۔ بے شک وہ (اللہ) بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے

بعض مسلمان مفسرین اور محدثین اس آیت میں بیان شدہ کلمات کی تفسیر کے بارے میں مندرجہ ذیل روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں جو کہ اس روایت کو غور سے پڑھنے کے بعد خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔

طبرانی نے اپنی کتاب "المعجم الصغیر" میں حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک صحاح میں ابونعیم اصفہانی اور بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں ابن عساکر شامی نے اپنی تاریخ کی کتاب میں علامہ سیوطی نے الدرالمنثور میں اور آلوسی نے اپنی کتاب "روح المعانی" میں (مستدرک حاکم۔ جلد ۲۔ ص ۶۱۵ روح المعانی جلد ۱۔ ص ۲۱۷ الدرالمنثور جلد ۱۔ ص ۵۹ میں درج ذیل حدیث کو طبرانی ابونعیم اصفہانی اور بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے) حضرت عمر بن خطاب کے حوالے سے مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ جناب رسول خدا (ص) نے فرمایا:

لَمَّا اَذْنَبَ اٰدَمُ الَّذِیْ اَذْنَبَهٗ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَی السَّمَآءِ فَقَالَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ (ص) اِلَّا غَفَرْتَ لِیْ فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلَیْهِ وَمَنْ مُحَمَّدٌ (ص)؟ فَقَالَ تَبَارَكَ اسْمُكَ لَمَّا خَلَقْتَنِیْ رَفَعْتُ رَأْسِیْ اِلٰی عَرْشِكَ فَاِذَا فِیْهِ مَكْتُوْبٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مُحَمَّدٌ (ص) رَّسُوْلُ اللّٰهِ.....

ترجمہ:

جب آدم گناہ (ترک اولی) کے مرتکب ہوئے تو انہوں نے آسمان کی جانب سر اٹھایا اور کہا!

اے خدا! میں تجھ سے محمد (ص) کے صدقے سوال کرتا ہوں کہ مجھکو معاف کر دے۔

خدا نے ان (آدم) پر وحی نازل کی اور سوال کیا کہ محمد (ص) کون ہیں؟ آدم نے جواب دیا۔ جب تو نے مجھے خلق کیا اور میں نے تیرے عرش کی طرف سر اٹھا کر دیکھی تو میں نے وہاں یہ لکھا ہوا دیکھا تھا کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ص) اللہ کے رسول ہیں۔"

فَقُلْتُ: اَنَّهُ لَيْسَ اَحَدٌ اَعْظَمُ عِنْدَكَ قَدْرًا عَمَّنْ جَعَلْتَ اِسْمَهُ مَعَ اِسْمِكَ فَاَوْحَى اِلَيْهِ اَنَّهُ آخِرُ النَّبِيِّيْنَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ وَ لَوْلَاهُوَ لَمَا خَلَقْتُكَ۔ (حاکم نے اپنی مستدرک میں اس حدیث کا جو متن بیان کیا ہے وہ اس متن سے قدرے مختلف ہے البتہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے)۔

پس میں نے اپنے دل میں کہا: بے شک وہی (محمدؐ) تیرے نزدیک سب سے زیادہ باعظمت اور مقرب ہیں اسی لئے تو نے ان کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے چنانچہ اس کے بعد آدم پر وحی نازل ہوئی کہ وہ (محمدؐ) تمہاری ذریت میں آخری نبی ہوں گے اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں بھی خلق نہ کرتا۔

مذکورہ حدیث اور ہمارا عقیدہ

قرآنِ مجید میں ہمارے درمیان رائج عقیدوں کے برعکس لفظ "کلمات" کا اطلاق ذوات اور شخصیات پر کیا ہے جیسے:

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔

(سورۃ آل عمران - آیت - ۳۹)

خدا تم کو یحییٰ (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا۔

يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى

ابْنُ مَرْيَمَ۔

(سورۃ آل عمران - آیت - ۴۵)

اے مریم! خدا تم کو اپنے کلمے عیسیٰ بن مریم (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ ہے۔

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ

(سورۃ نساء - آیت - ۱۷۱)

مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح (نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے) بس خدا کے رسول اور اس کا کلمہ (حکم) تھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ۔

(سورۃ کہف - آیت - ۱۰۹)

(اے رسول) کہہ دو! اگر میرے پروردگار کے کلمات (کے لئے (لکھنے کے واسطے) سمندر (کا پانی) سیاہی بن جائے تو سمندر (کا پانی) ختم ہو جائے گا۔

وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ۔

(سورۃ لقمان - آیت - ۲۷)

ایک سمندر کی روشنائی دوسرے سات سمندر بھی اگر مدد کریں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مذکورہ آیت میں "کلمات" کا لفظ شخصیات کے لئے استعمال ہوا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کلمات سے مراد وہی ذوات مقدسہ ہیں جن سے توسل کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت شیعہ روایات میں دو طریقے سے بیان کی گئی ہے کبھی ان کلمات کے ذریعے ان مقدس ہستیوں کو اور کبھی ان کے وجودِ نورانی کو بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ اٰدَمَ رَاٰى مَكْتُوْبًا عَلَى الْعَرْشِ اَسْمَاءً مُعَظَّمَةً مُكَرَّمَةً فَسَاَلَ عَنْهَا۔ فَقِيْلَ لَهٗ هٰذِهٖ اَسْمَاءُ اَجَلِّ الْخَلْقِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْاَسْمَاءُ مُحَمَّدٌ وَعَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ۔ فَتَوَسَّلَ اٰدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلٰى رَبِّهٖ فِيْ قَبُوْلِ تَوْبَتِهٖ وَرَفْعِ مَنْزِلَتِهٖ۔

(مجمع البیان۔ جلد۔ ۱۔ ص ۸۹۔ طبع صیدا۔ تفسیر برہان۔ جلد۔ ۱۔ ص ۸۸۔ ۸۶
احادیث۔ ۲۔ ۵۔ ۶۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۲۷)

ترجمہ:

آدم نے جب ان ناموں کو دیکھا جو عرش پر لکھے ہوئے ہیں تو انہوں نے ان کے بارے میں سوال کیا، انہیں بتایا گیا کہ وہ خدا کی محترم مخلوق کے اسمائے گرامی ہیں وہ نام یہ ہیں۔ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ۔ پس آدم نے ان اسماء کو وسیلہ قرار دیتے ہوئے توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔

جبکہ دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم نے پنجتن پاک (علیہم السلام) کے انوار قدسیہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس قسم کی احادیث جاننے کے لئے تفسیر البرہان ج ۱۔ ص ۸۰ پر موجود احادیث نمبر ۱۳، ۱۵، ۱۶ سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تاریخ اور احادیث کی کتب کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ جناب رسول خدا (ص) سے جناب آدم کا توسل ایک مشہور و معروف امر ہے کیونکہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ روضۂ رسول مقبول (ص) میں امام مالک نے منصور دوانقی کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ:

هُوَ وَسِيلَتُكَ وَوَسِيلَةُ أَبِيكَ آدَمَ

وہ (یعنی جناب رسول اکرم (ص)) تمہارے اور تمہارے باپ آدم کا وسیلہ ہیں

اس کے علاوہ مسلمان شعراء نے بھی اس حقیقت کو اپنے اشعار میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ:

بِهِ قَدْ أَجَابَ اللهُ آدَمَ إِذْ دَعَا
وَنَجَّى فِي بَطْنِ السَّفِينَةِ نُوحَ
قَوْمٌ بِهِمْ غُفِرَتْ خَطِيئَةُ آدَمَ
وَهُمُ الْوَسِيلَةُ وَالنُّجُومُ الطُّلَّعُ

ترجمہ:

اس کے واسطے سے خدا نے آدم کی دعا قبول کی۔ کشتی نوح کو ساحل نجات تک پہنچایا۔ وہ لوگ جن کے واسطے سے آدم کا گناہ معاف کردیا۔ اور وہ لوگ جو درگاہ خداوندی کا واسطہ ہیں ان کی مثال روشن ستاروں کی طرح ہے۔

حدیث نمبر۔ ۴

رسول خدا (ص) کا اپنے سے قبل کے انبیاء کو وسیلہ قرار دینا

لَمَّا مَاتَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَسَدٍ۔ دَخَلَ عَلَيْهَا رَسُولُ اللهِ (ص) فَجَلَسَ عِنْدَ رَأْسِهَا فَقَالَ۔ رَحِمَكِ اللهُ يَا أُمِّي بَعْدَ أُمِّي۔ ثُمَّ دَعَا رَسُولُ اللهِ (ص) أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ وَأَبَا أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيَّ وَعُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَغُلَامًا أَسْوَدَ۔ يَحْفِرُونَ۔ فَحَفَرُوا قَبْرَهَا فَلَمَّا بَلَغُوا اللَّحْدَ حَفَرَ رَسُولُ اللهِ (ص) بِيَدِهِ وَأَخْرَجَ تُرَابَهُ۔ فَلَمَّا فَرَغَ دَخَلَ رَسُولُ اللهِ (ص) فَاضْطَجَعَ فِيهِ۔ ثُمَّ قَالَ۔ اللهُ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ اغْفِرْ لِأُمِّي فَاطِمَةَ بِنْتِ أَسَدٍ وَوَسِّعْ عَلَيْهَا مَدْخَلَهَا بِحَقِّ نَبِيِّكَ وَالْأَنْبِيَاءِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِي۔

ترجمہ:

جب فاطمہ بنت اسد کا انتقال ہوا تو ان کے انتقال کی اطلاع ملنے کے بعد جناب رسول خدا (ص) ان کے سرہانے آکر بیٹھے اور کہا: اے میری ماں کے بعد ماں کا درجہ رکھنے والی! خدا تجھ پر رحمت نازل فرمائے اس کے بعد آپؐ نے اسامہ، ابوایوب، عمر بن خطاب اور ایک سیاہ فام غلام سے کہا کہ وہ ایک قبر تیار کریں۔ جب قبر تیار ہو گئی تو جناب

رسولِ اکرم (ص) نے اپنے ہاتھوں سے لحد تیار کی اور اس کی مٹی کو اپنے مبارک ہاتھوں سے نکالا پھر قبر میں ایک کروٹ سے لیٹ گئے اور یہ دعا پڑھی۔

اے وہ خدا! جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے جو خود ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں ہے۔ میری ماں فاطمہ بنتِ اسد کو بخش دے۔ اس کی قبر کو وسیع فرما۔ اپنے نبی محمدؐ اور مجھ سے قبل کے انبیاء (علیہم السلام) کے صدقے

(سید احمد زینی دحلان۔ اپنی کتاب "الدرر السنیہ" کے ص ۔ ۱۰ پر لکھتا ہے کہ قاضی عیاض نے ان واقعات کو صحیح اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے امام سبکی ان واقعات کو اپنی کتاب "شفاء السقام" میں "سمھودی" خلاصہ الوفا میں علامہ قسطلانی "المواہب اللدنیہ" میں اور ابن حجر اپنی کتاب "الجواہر المنظم" میں یوں رقمطراز ہیں کہ یہ واقعات صحیح اسناد کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں علامہ زرقانی "مواہب" کی شرح میں کہتے ہیں کہ ابن فہد نے قابلِ قبول سند کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے جبکہ قاضی عیاض نے بھی اس کی صحیح سند پیش کی ہے)

"خلاصہ الکلام" کا مصنف کہتا ہے کہ:۔

رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيْرِ وَالْاَوْسَطِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحُوْهُ۔

(کشف الارتیاب ص ۳۱۲ ۔ از خلاصۃ الکلام)

اس حدیث کو طبرانی نے اپنی کتاب معجم الکبیر اور الاوسط میں بیان کیا ہے جب کہ ابن حبان اور حاکم نے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہے۔

سید احمد زینی دحلان اپنی کتاب "الدرر السنیہ فی الرد علی الوھابیۃ" میں لکھتے ہیں کہ:

رَوَى ابْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ عَنْ جَابِرٍ مِثْلَ ذٰلِكَ وَكَذَا رَوَى مِثْلَهُ
ابْنُ عَبْدِ الْبِرِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَرَوَاهُ اَبُوْ نُعَيْمٍ فِيْ حِلْيَةِ الْاَوْلِيَاءِ
عَنْ اَنَسٍ. ذَكَرَ ذٰلِكَ كُلَّهُ الْحَافِظُ جَلَالُ الدِّيْنِ السُّيُوْطِيُّ
فِيْ جَامِعِ الْكَبِيْرِ (دیکھئے الدرر السنیہ ص ۸ ۔ اور وفاء الوفا جلد ۳ ص ۸۹۹)

مشہور محدث ابن ابی شیبہ نے جابر کے حوالے سے مذکورہ حدیث کو بیان کیا ہے اور

اسی حدیث کو عبد البر ابن عباس، ابونعیم اور انس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جلال الدین سیوطی نے ان تمام مطالب کو اپنی کتاب جامع الکبیر میں بیان کیا ہے۔

مذکورہ حدیث مندرجہ ذیل کتابوں میں مختلف انداز سے بیان کی گئی ہے ان میں سے کچھ زیرِ گفتگو دعا پر مشتمل ہیں جبکہ بعض میں یہ دعا ذکر نہیں کی گئی۔

۱۔ الاستیعاب: جلد ۴ ۔ ص ۔ ۳۸۲ مصنف ابن البر وفات ۴۶۳ ھجری

۲۔ مستدرک حاکم: جلد ۳ ۔ ص ۔ ۱۰۸

۳۔ اصولِ کافی: جلد ۱ ۔ ص ۴۵۳ ۔ مصنف مرحوم کلینی وفات ۳۲۹ ھجری کتاب الحجۃ باب مولد امیر المومنین

۴۔ حلیۃ الاولیاء: مصنف ابونعیم اصفہانی ۔ جلد ۳ ۔ ص ۱۲۱

حدیث نمبر ۵

حضورؐ کی ذات سے توسّل

کچھ محدثین بیان کرتے ہیں کہ ایک صحرا نشین عرب آنحضور (ص) کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا:۔

لَقَدْ اَتَيْنَاكَ وَمَا لَنَا بَعِيْرٌ يَئِطُّ لَنَا وَلَا صَبِيٌّ يَغِطُّ

("یئط" مشتق ہے اطیط سے جس کے معنی اونٹ کی آواز کے ہیں۔ جبکہ "یغط" مشتق ہے "غطیط" سے اور اس کے معنی اس آواز کے ہیں جو بچہ سوتے میں نکالتا ہے)

ترجمہ: ہم تیری جانب آئے ہیں حالانکہ نہ ہمارے پاس اونٹ ہے جو بڑبڑائے اور نہ ہی کوئی بچہ ہے جو ہماری آغوش میں سوئے۔

اس کے بعد اس نے یہ اشعار پڑھے ؎

اَتَيْنَاكَ وَالْعَذْرَاءُ يَدْمِيْ لِبَانُهَا ۔۔۔ وَقَدْ شُغِلَتْ اُمُّ الصَّبِيِّ عَنِ الطِّفْلِ
وَلَا شَيْءَ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ عِنْدَنَا ۔۔۔ سِوَى الْحَنْظَلِ الْعَامِيِّ وَالْعِلْهِزِ الْفَسْلِ
وَلَيْسَ لَنَا اِلَّا اِلَيْكَ فِرَارُنَا ۔۔۔ وَاَيْنَ فِرَارُ النَّاسِ اِلَّا اِلَى الرُّسُلِ

ترجمہ:

ہم تیری جانب آئے ہیں حالانکہ گھوڑوں کے سینے سے خون ٹپک رہا ہے ماؤں کو بچوں سے دور کردیا گیا ہے، ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

صرف تلخ حنظل ہے جو قحط سالی کے زمانے میں کھاتے ہیں اور سڑی ہوئی روٹی کے ٹکڑے یا خونِ جگر، ہمارے پاس اسکے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ تیرے دامن میں پناہ لیں۔ اور لوگوں کو انبیاء کے دامن کے سوا اور کہاں پناہ مل سکتی ہے

فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) یَجُرُّ رِدَائَہٗ حَتّٰی صَعِدَ الْمِنْبَرَ، فَرَفَعَ یَدَیْہِ: اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثاً مُغِیْثًا.... فَمَا رَدَّ النَّبِیُّ (ص) یَدَیْہِ حَتّٰی اَلْقَتِ السَّمَآءُ..... ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاللّٰہِ لَوْ کَانَ اَبِیْ طَالِبُ حَیًّا لَقَرَّتْ عَیْنَاہُ.... مَنْ یُنْشِدُنَا قَوْلَہٗ؟ فَقَامَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ، وَ قَالَ وَکَاَنَّکَ تُرِیْدُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَوْلَہٗ:

وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ
ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَۃُ الْاَرَامِلِ
یَطُوْفُ بِہِ الْھَلَاکُ مِنْ آلِ ھَاشِمٍ
فَھُمْ عِنْدَہٗ فِیْ نِعْمَۃٍ وَفَوَاضِلُ

پس جنابِ رسولِ خدا اٹھے اور عبا اپنے دوشِ مبارک پر لینے کے بعد منبر پر جلوہ افروز ہوئے آپ نے اپنے دونوں ہاتھ (دعا کے لئے) بلند کئے۔ بار الہا۔ ہمیں موسلا دھار بارش سے فیض یاب کر۔ ابھی رسولِ خدا (ص) کے اٹھنے والے ہاتھ گرے نہیں تھے کہ آسمان نے پانی اگلنا شروع کردیا۔ اس کے بعد رسولِ خدا (ص) نے فرمایا، خدا کی قسم اگر آج (میرے چچا) ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ کیا کوئی ہے جو مجھے ان کا (ابوطالبؑ کا) کلام سنائے؟ یہ سن کر حضرت علیؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے! یارسول اللہ (ص)، گویا آپ ان کا یہ کلام سننا چاہتے ہیں کہ:

وہ سفید و نورانی چہرہ جس پر بادلوں سے بارش کی تمنا کی جاتی ہے اور جو یتیموں کی پناہ گاہ بیوہ عورتوں کا ہاتھ تھامنے والا ہے۔ مشکلات میں پھنسے ہوئے فرزندانِ ہاشم اس کی بستی کے گرد گھومتے ہیں اور وہ اس کے نزدیک نعمت و بخشش میں ہیں۔

یہ سن کر جناب رسولِ خدا (ص) نے فرمایا: ہاں میرا مقصد یہی تھا جو تم نے پورا کردیا۔

فَاَنْشَدَ عَلِیٌّ اَبْیَاتًا مِنَ الْقَصِیْدَۃِ وَالرَّسُوْلُ یَسْتَغْفِرُ لِاَبِیْ طَالِبٍ عَلَی الْمِنْبَرِ ثُمَّ قَالَ رَجُلٌ مِنْ کِنَانَۃٍ وَاَنْشَدَ۔

اس کے بعد حضرت علی (ع) نے جناب ابوطالب کے قصیدے کے چند اشعار پڑھ کر سنائے اور اس دوران جناب رسولِ خدا (ص) منبر پہ بیٹھے ابوطالبؑ کی مغفرت کے لئے دعا فرماتے رہے پھر بنی کنانہ کے قبیلے کا ایک شخص کھڑا ہوا اور ایک شعر پڑھا۔

○

مندرجہ بالا واقعہ کے سلسلے میں بیشمار ثبوت بیان کئے گئے ہیں تاہم مصنف نے مندرجہ ذیل کتب کے حوالے سے اس واقعہ کو پیش کیا ہے۔

۱۔ عمدۃ القاری فی شرح حدیث البخاری۔ جلد۔ ۷ صفحہ۔ ۳۱ ۔ مصنف بدرالدین محمود بن احمد العینی۔ متوفی۔ ۸۵۵ ھجر۔ طبع۔ ادارۃ طباعتہ المنیریہ

۲۔ شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید؛ جلد۔ ۱۴۔ ص ۸۰۔

۳۔ سیرۃ الحلبی جلد۔ ۳۔ ص ۲۶۳

۴۔ الحجۃ علی الذاہب الی تکفیر ابی طالب۔ تالیف شمس الدین ابی علی فخار بن معد متوفی ۶۳۰ ھجر۔ طبع۔ نجف اشرف علوی پریس ص ۷۰۔

۵۔ سیرۃ زینی دحلان؛ یہ کتاب سیرۃ حلبی کے حاشیہ پر ہے۔ جلد۔ ۱۔ ص۔ ۸۱

○

حدیث نمبر۔ ۶

آنحضور (ص) کی ذات سے توسّل

إِنَّ سَوَادَ بْنَ قَارِبٍ رَضِيَ اللهُ۔ أَنْشَدَ لِرَسُولِ اللهِ قَصِيدَتَهُ الَّتِي فِيهَا التَّوَسُّلَ۔ إِنَّهُ قَالَ:

وَأَشْهَدُ أَنَّ اللهَ لَا رَبَّ غَيْرُهُ

وَأَنَّكَ مَأْمُونٌ عَلَى كُلِّ غَائِبِ

وَأَنَّكَ أَدْنَى الْمُرْسَلِينَ وَسِيلَةً

إِلَى اللهِ يَابْنَ الْأَكْرَمِينَ الْأَطَايِبِ

فَمُرْنَا بِمَا يَأْتِيكَ يَا خَيْرَ مُرْسَلٍ

وَإِنْ كَانَ فِيمَا فِيهِ شَيْبُ الذَّوَائِبِ

وَكُنْ لِي شَفِيعًا يَوْمَ لَا ذُو شَفَاعَةٍ

بِمُغْنٍ فَتِيلًا عَنْ سَوَادِ بْنِ قَارِبِ

ترجمہ:

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور تو انسانی حس سے پوشیدہ ہر چیز پر نظر رکھتا ہے۔

قابلِ اطمینان و سکون ہے یہ امر کہ دوسرے انبیاءؑ کے مقابلے میں آپ (حضرت محمدؐ) خدا کی جانب نزدیک ترین اور بہترین وسیلہ ہیں۔ اے محترم اور پاکیزہ ہستیوں کے فرزند (ص)، ہمیں حکم دیجئے وہی جو آپ کو دیا گیا ہے اے خیرِ رُسل۔ چاہے آپؐ کے حکم پر عمل کرنے کے لئے سر کے بالوں کو سفید کرنا پڑے۔

آپ میری شفاعت کیجیے گا۔ اس روز جب کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت کھجور کے دانے کی مانند بھی سواد بن قارب کے کام نہیں آئے گی۔

(دیکھئے الدرر السنیۃ) ص۔ ۲۹۔ مصنف زینی دحلان۔ اور التوصل الی حقیقۃ التوسل ص۔ ۳۰۰)

یہ تو تھیں وہ چند احادیث جنکا تعلق "توسّل" کے مسئلہ سے ہے اور جنہیں ہم نے اہلِ سنت کی معتبر کتب ہائے احادیث کے حوالے سے بطورِ ثبوت پیش کیا ہے رہ گیا مسئلہ اہلِ تشیع کا تو شیعوں کے نزدیک ذواتِ مقدسہ سے توسّل مسلّم امر ہے اور ان کے ہاں بیشمار ایسی ادعیہ موجود ہیں جو توسل سے ہی متعلق ہیں۔

بہرحال! قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ آیا ہم اسلامی احکامات "ابن تیمیہ" اور محمد بن عبدالوہاب جیسے افراد سے حاصل کریں یا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں جناب رسولِ اکرم (ص) اور ان کی اس اہل بیت (ع) سے اخذ کریں جو حدیثِ ثقلین کے مطابق ثقل اصغر اور قرآن مجید کے ہم پلہ ہیں؟

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "صحیفۂ علویہ" حضرت حسین ابن علی علیہما السلام کی "دعائے عرفہ" یا پھر "صحیفۂ سجادیہ" میں جو ادعیہ بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک دو احادیث کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

حدیث نمبر۔ ۷

حضرت سید الشہداء (ع) دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ فِي هٰذِهِ الْعَشِيَّةِ الَّتِي فَرَضْتَهَا وَعَظَّمْتَهَا بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّكَ وَرَسُولِكَ وَخِيَرَتِكَ مِنْ خَلْقِكَ

ترجمہ:

اے خدا ایسی رات کو جو کہ تو نے مجھ پر واجب اور اہم قرار دی ہے ہم تیری جانب

توجہ کرتا ہوں تجھ کو پیغمبر محمدؐ، تیرے رسول اور تیری اہم ترین مخلوق کی قسم دیتا ہوں۔

حدیث نمبر ۸:

ماہ مبارک رمضان اور اس مہینے میں عبادت کرنے والوں کی حرمت سے توسل

حضرت علی بن حسینؑ ماہ مبارک رمضان کے دوران درج ذیل دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ هٰذَا الشَّهْرِ وَبِحَقِّ مَنْ تَعَبَّدَ لَكَ فِیْهِ مِنْ اِبْتِدَائِهٖ اِلٰی وَقْتِ فَنَائِهٖ مِنْ مَلَكٍ قَرَّبْتَهٗ اَوْ نَبِیٍّ اَرْسَلْتَهٗ اَوْ عَبْدٍ صَالِحٍ اَخْتَصَصْتَهٗ

(صحیفہ سجادیہ - دعا - ۴۴)

ترجمہ:

اے خدا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اس ماہ مبارک میں اور ان لوگوں کے واسطے سے جو اس مہینے کے شروع سے آخر تک تیری عبادت کرتے ہیں چاہے وہ تیرا مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل، یا تیرا منظور نظر نیک بندہ ہو۔

توسل کے سلسلے میں مسلمانوں کی روش

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد بھی مسلمانوں کی روش یہ تھی کہ وہ اولیاء اللہ کی ذات اور ان کے مقام و منزلت سے توسل حاصل کرتے تھے۔ یہاں پر اس کے کچھ نمونے بیان کئے جائیں گے۔

۱۔ ابن اثیر عزالدین علی بن محمد بن محمد بن عبدالکریم جزری وفات ۶۳۰ ہجری اپنی کتاب "اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ" میں لکھتا ہے:

وَاسْتَسْقٰی عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ بِالْعَبَّاسِ عَامَ الرَّمَادَةِ لَمَّا اشْتَدَّ الْقَحْطُ فَسَقَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِهٖ وَاَخْصَبَتِ الْاَرْضُ فَقَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللّٰهِ الْوَسِیْلَةُ اِلَی اللّٰهِ وَالْمَكَانُ مِنْهُ وَقَالَ حَسَّانُ:

سَاَلَ الْاِمَامُ وَقَدْ تَتَابَعَ جَدْبُنَا
فَسَقَی الْغَمَامُ بِغُرَّةِ الْعَبَّاسِ
عَمِّ النَّبِیِّ وَصِنْوِ وَالِدِهِ الَّذِیْ
وَرِثَ النَّبِیَّ بِذٰلِكَ دُوْنَ النَّاسِ
اَحْیَا الْاِلٰهُ بِهِ الْبِلَادَ فَاَصْبَحَتْ
مُخْضَرَّةَ الْاَجْنَابِ بَعْدَ الْیَاسِ
وَلَمَّا سَقَی النَّاسُ طَفِقُوْا یَتَمَسَّحُوْنَ بِالْعَبَّاسِ وَیَقُوْلُوْنَ
هَنِیْئًا لَكَ سَاقِیَ الْحَرَمَیْنِ

(اسد الغابہ ج ۳ - ص - ۱۱۱ - طبع مصر)

ترجمہ:

مسلسل خشک سالی کے زمانے میں جب قحط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے وسیلے سے بارش کی درخواست کی۔ خداوند عالم نے ان کے وسیلے سے گندم کی پیداوار میں اضافہ کیا اور زمینیں سرسبز ہو گئیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا: خدا کی قسم (حضرت) عباسؓ ہمارا وسیلہ ہیں خدا کی جانب اور وہ خدا کے نزدیک ایک مقام رکھتے ہیں حسان بن ثابت نے اس سلسلے میں شعر نظم کئے ہیں جن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

جب شدید قحط نے سب جگہ غلبہ کر لیا تھا تو پیشوا نے بارش کی درخواست کی۔ اس وقت آسمان پر چھائے بادلوں نے عباس کی نورانیت سے لوگوں کو سیراب کیا۔ عباسؓ جو کہ پیامبرؐ کے چچا اور پیامبرؐ کے والد کے ہم پلہ تھے۔

مقام و منزلت کی میراث انہی سے ان کو پہنچی تھی۔ خداوند عالم نے ان کے وسیلے سے سرزمین کو زندہ کیا! نا امیدی کے بعد ساری زمین سرسبز ہو گئی اور جب بارش نے ساری زمین کو سیراب کر دیا تو لوگ تبرک کے طور پر حضرت عباسؓ کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے مرحبا، تو دو حرموں کا ساقی ہے۔"

اس تاریخی قطعہ کو پڑھنے کے بعد جس کا کچھ حصہ "صحیح بخاری" میں بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب منزلت و محترم ذات سے توسل جو کہ دعا اور متوسل میں قرب اور شائستگی کا سبب بنتا ہے وسیلے کی ایک بہترین مثال ہے۔

۲۔ قسطلانی احمد بن محمد بن ابی بکر جو کہ جلال الدین سیوطی (وفات ۹۲۳ ہجری) کا ہم عصر ہے اپنی کتاب المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیۃ فی السیرۃ النبویۃ میں جو کہ مصر سے چھاپی گئی ہے لکھتا ہے کہ:

اِنَّ عُمَرَ لَمَّا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ص) كَانَ يَرَى لِلْعَبَّاسِ مَا يَرَى الْوَلَدُ لِلْوَالِدِ فَاقْتَدُوْا بِهٖ فِيْ عَمِّهٖ وَاتَّخِذُوْهُ وَسِيْلَةً اِلَى اللهِ تَعَالٰى فَفِيْهِ التَّصْرِيْحُ بِالتَّوَسُّلِ وَ بِهٰذَا يُبْطِلُ قَوْلَ مَنْ مَنَعَ التَّوَسُّلَ مُطْلَقًا بِالْاَحْيَاءِ وَالْاَمْوَاتِ وَقَوْلَ مَنْ مَنَعَ ذٰلِكَ بِغَيْرِ النَّبِيِّ۔

(دیکھیے المواہب ج ۳ ص ۳۰۰ مطبوعہ مصر اور فتح الباری کی شرح البخاری، ج ۲ ص ۴۱۳ مطبوعہ لبنان، ابن حجر عسقلانی اور عبد الباقی مالکی زرقانی کی شرح المواہب ص ۱۱۲۵ - ۱۰۵۵ پر)

جب حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے وسیلے سے بارش کی درخواست کی تو کہا! اے لوگو! پیغمبر خدا حضرت عباسؓ کو اپنے والد کی طرح سمجھتے تھے، ان کی پیروی کرو اور ان کو خدا کی جانب اپنا وسیلہ بناؤ۔ اس عمل سے واضح طور پر یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ توسل مکمل طور پر یا پیامبرؐ کے علاوہ کسی اور سے توسل صحیح نہیں ہے۔

۳۔ جب منصور دوانقی نے مدینہ منورہ کے مفتی اعظم امام مالک سے سوال کیا تھا کہ:

يَا اَبَا عَبْدِ اللهِ اَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ وَاَدْعُوْا اَمْ اَسْتَقْبِلُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ....؟

آیا قبلے کی جانب رُخ کر کے دعا کروں یا پیغمبر اکرمؐ کی جانب رُخ کر کے دعا کروں تو امام مالک نے جواب دیا تھا کہ:

لِمَ تَصْرِفُ وَجْهَكَ عَنْهُ وَهُوَ وَسِيْلَتُكَ وَوَسِيْلَةُ اَبِيْكَ اٰدَمَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اِلَى اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَلِ اسْتَقْبِلْهُ وَاسْتَشْفِعْ بِهٖ فَيُشَفِّعُكَ اللهُ قَالَ اللهُ تَعَالٰى۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ..... الخ

(وفا الوفا ج ۲ ص ۱۳۷۶)

کیوں اپنی صورت کو آپؐ سے پھیرتے ہو؟ آپؐ روز قیامت میں تیرے اور تیرے باپ حضرت آدم کے وسیلہ ہیں، آپؐ کی جانب رخ کرو اور آپؐ کو اپنا شفیع بناؤ، خداوند عالم آپ کی شفاعت کو قبول کرتا ہے۔

"خداوند فرماتا ہے کہ اگر وہ اپنے نفس پر ظلم کریں...... الخ

۴۔ ابن حجر ہیثمی نے اپنی کتاب "الصواعق المحرقہ" میں شافعی کے مندرجہ ذیل دو شعر بیان کئے ہیں۔ (مرحوم قاضی نور اللہ نے اپنی کتاب "الصوارم المحرقہ" میں مذکورہ کتاب کا جائزہ لیا ہے اور اس پر تنقید کی ہے)

اٰلُ النَّبِيِّ ذَرِيْعَتِيْ
وَهُمْ اِلَيْهِ وَسِيْلَتِيْ
اَرْجُوْا بِهِمْ اُعْطٰى غَدًا
بِيَدِ الْيَمِيْنِ صَحِيْفَتِيْ

(صواعق محرقہ ص ۱۷۸۔ طبع قاہرہ)

پیغمبر اکرمؐ کا خاندان خدا کی جانب میرا وسیلہ ہیں اور ان کے وسیلے سے میں امیدوار ہوں کہ میرے نامہ اعمال کو میرے دائیں ہاتھ میں دیں گے۔

ان سندوں اور الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ اور اہم پاک شخصیتیں وہ وسیلہ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (سورۂ مائدہ ۔ ۳۵) کا حکم دیا ہے وسیلہ، فرائض و محرمات کو انجام دینے پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ مستحبات جن میں انبیاء سے توسل بھی شامل ہے "وسیلہ" میں۔ آیا یہ ممکن ہے کہ یہ تمام علما اور دانشمند لفظ "وسیلہ" کے معنی سمجھنے میں خطا کریں؟ جب کہ ان لوگوں کا شمار

اسلامی احکام کے صادر کرنے والوں، احادیث کے مخالفین اور معروف اسلامی دانشمندوں اور مفکروں میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اس قسم کی توضیحات اور گواہیوں کو اہمیت نہیں دیتے اور ان کی تاویلات کی فکر میں رہتے ہیں۔ ان قبلی فیصلہ کرنے والوں میں سے ہیں جو اپنے قبلی فیصلوں کی وجہ سے ان گواہیوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اس تعصب اور قبلی فیصلے کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اس تاریخی حادثہ کے بارے میں ہم بخاری سے ایک بیان کو پیش کرتے ہیں اُس کے بعد دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں تعصب کے پردے نے کیا تحریف انجام دی ہے اور کیا ہنگامہ کیا ہے۔

۵۔ بخاری نے اپنی "صحیح" میں تحریر کیا ہے۔

اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ اِذَا قَحَطُوا اِسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ كُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَيُسْقَوْنَ۔

(صحیح بخاری باب نماز استسقا جلد ۲ ص ۳۲، طبع محمد علی صبیح)

ترجمہ:

حضرت عمرؓ بن الخطاب قحط کے موقعوں پر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے توسل حاصل کرتے تھے اور کہتے تھے: اے پروردگار ہم ماضی میں تیرے پیغمبرؐ سے متوسل ہوتے تھے اور تو اپنی رحمت نازل فرماتا تھا۔ اب تیرے پیغمبرؐ کے چچا سے متوسل ہوتے ہیں لہٰذا اپنی رحمت نازل فرما چنانچہ اس موقع پر بارش شروع ہوئی اور ذرہ ذرہ سیراب ہوگیا۔

مذکورہ بالا حدیث کی درستی و صحت کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے یہاں تک کہ "رفاعی" بھی جو کہ مختلف طریقوں سے توسل کے بارے میں متواتر احادیث کی نفی کرتا ہے اس حدیث کی صحت کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے:

اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ صَحِيْحٌ .... يَانُ صَحَّ هٰذَا الْجَوَازُ شَرْعًا

فَنَحْنُ مِنْ اَسْبَقِ النَّاسِ اِلَى الْاَخْذِ بِهٖ وَالْعَمَلِ بِمُقْتَضَاهُ

بے شک یہ حدیث صحیح ہے ...... اگر حدیث کا مطلب افراد سے توسل حاصل کرنا ہے تو ہم اولین افراد میں سے ہیں جو اس کے معنی کو سمجھتے ہیں، اور اس پر عمل کرتے ہیں اُن جملوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو حضرت عباسؓ سے توسل کے سلسلے میں خود خلیفہ ثانی نے بیان کئے ہیں اور خاص طور سے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں ھذا واللہ الوسیلۃ الی اللہ

اگر غور و فکر کیا جائے تو پھر توسل کی حقیقت اور اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے نیز یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی کی ذات، شخصیت یا پھر اس کے مقام و مرتبے کو بھی اسی طرح "وسیلہ" قرار دیا جاسکتا ہے جس طرح "ابن عباس" کو مذکورہ روایت کے مطابق وسیلہ قرار دیا گیا۔

شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن النعمان مالکی "وفات ۶۸۳ ہجری" اپنی کتاب "مصباح الظلام فی المستغیثین بخیر الانام" میں ابن عباس کے حوالے سے حضرت عمرؓ کے توسل کے طریقے کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَقِيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّكَ (ص) وَنَسْتَشْفِعُ اِلَيْكَ بِشَيْبَتِهٖ فَسُقُوْا

وَفِيْ ذٰلِكَ يَقُوْلُ عَبَّاسُ بْنُ عُتْبَةَ بْنِ اَبِيْ لَهَبٍ ـ

بِعَمِّيْ سَقَى اللّٰهُ الْحِجَازَ وَاَهْلَهٗ

عَشِيَّةَ يَسْتَسْقِيْ بِشَيْبَتِهٖ عُمَرُهٗ

اے خدا ہم تیرے نبیؐ کے چچا کے وسیلے سے بارش کی درخواست کرتے ہیں اور اسلام میں ان کے مبارک پرنور محاسن کو اپنا شفیع قرار دیتے ہیں اس موقع پر خدا کی رحمت سب جگہ چھا گئی۔

عباس بن عتبہ نے اس سلسلے میں شعر کہے ہیں وہ کہتا ہے: میرے چچا کی برکت سے سرزمین حجاز اور اس کے بسنے والے اسی وقت سیراب ہو گئے جب غروب کے وقت عمرؓ ان کے محاسن سے متوسل ہوئے۔

اسی طرح حسان بن ثابت نے بھی اس سلسلے میں ایک شعر کہا ہے:

فَسَقَى الْغَمَامُ بِغُرَّةِ الْعَبَّاسِ

ابن حجر عسقلانی "فتح الباری فی شرح حدیث البخاری" میں کہتا ہے حضرت عباس نے اپنی دعا میں کہا :

وَقَدْ تَوَجَّهَ الْقَوْمُ بِیْ اِلَیْكَ لِمَكَانِیْ مِنْ نَبِیِّكَ

لوگوں نے اس رشتہ داری کی وجہ سے جو مجھے تیرے نبیؐ سے ہے میری جانب رُخ کیا ہے۔

(دیکھئے مذکورہ بالا کتاب ج ۔ ۲ ۔ ص ۴۱۳ ۔ طبع لبنان)

ہر حال جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے پیش نظر رکھنے کے بعد اگر غور و فکر کیا جائے تو پھر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مذکورہ بالا واقعہ میں حضرت ابنِ عباس کو اپنے مقام و عظمت کی بنا پر ہی وسیلہ قرار دیا گیا ہے پھر ہم سب جانتے ہیں کہ بہت قدیم کہاوت ہے کہ :

تَعْلِیْقُ الْحُكْمِ بِالْوَصْفِ مُشْعِرٌ بِالْعِلِّیَّةِ

یعنی جب کبھی کسی موضوع کے بارے میں حکم دیا جائے تو اس حکم کا اپنی ضد کے خلاف ہونا اس حکم کے اثبات کی دلیل بن جاتا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی کہ

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ (سورۃ بقرہ آیت ۲۳۳)

عورت کی زندگی میں اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اس مرد سے متعلق ہے جس کے لئے عورت بچے پیدا کرتی ہے۔

مذکورہ مفہوم حکم کا سبب بیان کرنے کی وجہ سے اخذ کیا گیا ہے یعنی یہ جاننے کے بعد کہ عورتیں اپنے شوہروں کے لئے بچے پیدا کرتی ہیں تسلیم کیا گیا ہے کہ اپنی بیویوں کو نان و نفقہ فراہم کرنا مردوں کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ عالم اور دانشمند کا احترام کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ احترام متعلقہ شخص کے علم و دانش کی بنا پر ہے چنانچہ حضرت عمر کا یہ قول کہ۔

اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْكَ بِعَمِّ نَبِیِّكَ اس امر کا اظہار ہے کہ آخر وہ کون سا سبب ہے جس کی بنا پر انہوں نے (حضرت عمرؓ) دیگر افراد کے مقابلے میں "ابن عباس" ہی کو وسیلہ قرار دینے کے معاملے کو ترجیح دی ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار خود ابن عباس نے اپنے

قول میں یہ کہہ کر کیا کہ لِمَكَانِیْ مِنْ نَبِیِّكَ ۔ یعنی مجھے تیرے نبی سے جو قریبی ربط اور تعلق حاصل ہے اس کی وجہ سے ان لوگوں نے مجھے تیری (اللہ کی) طرف متوجہ ہونے کا "وسیلہ" قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ صدرِ اسلام میں مسلمان نیک اور صالح افراد سے توسّل حاصل کرتے تھے۔

۶ ۔ جنابِ رسولِ خدا (ص) کے غم میں جناب صفیہ کے اشعار

جناب رسولِ خدا (ص) کی پھوپھی "صفیہ بنت عبدالمطلب" نے آپؐ کی وفات پر کچھ شعر کہے ہیں ذیل میں ان میں سے دو شعر بیان کئے جاتے ہیں۔

اَلَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْتَ رَجَاؤُنَا
وَكُنْتَ لَنَا بَرًّا وَلَمْ تَكُ جَافِیًا
وَكُنْتَ بِنَا بَرًّا رَؤُفًا نَبِیُّنَا
لِیَبْكِ عَلَیْكَ الْقَوْمُ مَنْ كَانَ بَاكِیًا

ترجمہ :

اے پیغمبر اکرمؐ آپ ہماری امید ہیں۔ آپ ایک نیک انسان تھے اور آپ نے کبھی بھی جفا نہیں کی۔ آپ کا حسن سلوک اور مہربانی ہمیشہ ہمارے شامل حال تھا۔ اے ہمارے پیغمبر اس قوم کا ہر فرد رو رہا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کہ آپ کے لئے روئیں۔

(ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی ص ۲۵۲ ۔ مصنف حافظ محب الدین احمد بن عبداللہ طبری پیدائش ۶۱۵ھ وفات ۶۹۴ھ ناشر مکتبہ القدس قاہرہ ۔ مجمع الزوائد ج ۹ ۔ ص ۳۶ دوسرا ایڈیشن مصنف حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کتاب میں پہلے مصرعہ میں "انت رجاؤنا" کی بجائے "کنت رجاؤنا" چھپا ہوا ہے)

مندرجہ بالا قطعہ جو جناب رسولِ اکرم (ص) کے اصحاب کے حضور پڑھا گیا اسے مورّخین اور سیرت نگاروں کی بھاری تعداد نے بیان کیا ہے۔ اس قطعہ میں [illegible]

۱۔ ازواجِ یا رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد آپؐ سے بات کرنا ایک جائز اور رائج بات تھی اور وہابیوں کے خیال کے خلاف اس بات کے کرنے اور مکالمہ میں نہ تو شرک ہے اور نہ ہی بیہودگی کیونکہ کہا گیا ہے "الایا رسول اللہ" (ص)۔

۲۔ "انت رجاؤنا" والے جملے کے مطابق پیغمبر اکرمؐ ہر حال میں اسلامی جامعہ کے لئے باعثِ رحمت واُمید تھے یہاں تک کہ آپؐ کی وفات کے بعد بھی ہمارا آپ سے تعلق ختم نہیں ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

(سورۃ مائدہ ، آیت ۳۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے۔

اگرچہ مذکورہ آیت کلی طور پہ بیان کرتی ہے کہ "وسیلہ" حاصل کرو لیکن "وسیلہ" سے مراد کیا ہے؟ آیت میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ دینی فرائض کا ادا کرنا نجات کا ذریعہ ہے لیکن صرف یہی ایک وسیلہ نہیں ہے بلکہ اگر اولیاء اللہ سے توسل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ عمل خود بھی نجات کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے یہی بات امام مالک کی منصور سے گفتگو اور دوسرے خلیفہ کی رسولِ خداؐ کے چچا کے توسل سے بارش کی دعا سے واضح ہوتی ہے۔

○

باب ۷

آیا اولیائے خدا کا یومِ ولادت اور یومِ وفات منانا بدعت ہے؟

وہابی طبقہ اولیائے کرام اور انبیائے خدا کے یومِ ولادت اور یومِ وفات کو عقیدت و احترام سے منانے کے عمل کو جس انداز سے بدعت اور حرام قرار دیتا ہے اسے پیشِ نظر رکھ کر اگر غور و فکر کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ طبقہ بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور انبیائے خدا کا سخت ترین دشمن ہے۔

أَنْصَارُ السُّنَّةِ الْمُحَمَّدِيَّة نامی جماعت کے سربراہ محمد حامد لفقی نے "الفتح المجید" نامی کتاب کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

اَلذِّكْرَيَاتُ الَّتِي مَلَأَتِ الْبِلَادَ بِاسْمِ الْأَوْلِيَاءِ هِيَ نَوْعٌ مِنَ الْعِبَادَةِ لَهُمْ وَتَعْظِيمِهِمْ

مختلف اسلامی ممالک میں اولیائے کرام کے نام پر جو تقریبات منعقد ہوتی ہیں وہ ایک قسم کی عبادت ہیں اور انہیں اولیائے کرام کی تعظیم کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے۔

("فتح المجید" ص ۱۵۴) آج کل جب کہ تمام اسلامی ممالک میں رسولِ اکرمؐ کی پیدائش کے موقع پر "عید میلاد" منائی جاتی ہے سعودی "مفتی بن باز" حضورؐ کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کے اجتماع کو حرام اور بدعت اعلان کرتا ہے۔ لیکن یہی شخص "فیصل سعودی" کی سلطنت کے دوران اس کو "امیر المومنین" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ یہ خطاب اس قدر مسخرہ آمیز تھا کہ "خان" کو بھی احساس ہو گیا اور انتہائی خاکسارانہ انداز میں اس لقب کو قبول کرنے سے معافی چاہی)

"وہابیوں" کی تمام غلطیوں کی بنیاد صرف ایک لفظ ہے وہ یہ کہ وہ شرک و توحید اور خاص طور سے "عبادت" کے معنی کے لئے کوئی حد وغیرہ معین نہیں کرتے، اسی وجہ سے ہر جشن یا مجلس کو بندگی اور پرستش سمجھتے ہیں۔ مندرجہ بالا جملے میں لفظ "عبادت اور تعظیم" کو ایک ساتھ مترادف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں۔

آئندہ باب میں "عبادت" کی تشریح کی جائے گی اور یہ ثابت کیا جائے گا کہ خدا کے نیک بندوں کی تکریم و تعظیم اس حقیقت کے باوجود کہ "بندگانِ خدا" میں کسی بھی وجہ سے ان کی زیارت کو پرستش نہیں کہا جا سکتا۔ کسی اعتبار سے شرک نہیں کہلا سکتی۔

کیا اس امر میں شک و شبے کی گنجائش ہے کہ قرآن مجید میں نہایت فصیح و بلیغ انداز سے بعض انبیا اور اولیائے کرام کی تعریف کی گئی ہے؟

کیا قرآن مجید میں حضرتِ زکریا، حضرت عیسیٰ اور .... کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ۔ (سورۂ انبیاء آیت ۹۰)

ترجمہ:

"یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

لہٰذا آج اگر کوئی کسی مجلس میں جو ان کے نام سے منعقد کی جاتی ہے اس آیت کے مطابق ان کی توصیف و تعریف کرے تو کیا یہ عمل قرآن کی پیروی نہیں ہے؟

کیا خداوندِ عالم نے خاندانِ رسالت کے بارے میں نہیں فرمایا کہ؟ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ۔ یعنی وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں؟ اور اگر یہ درست ہے تو پھر بتائیں کہ آج اگر حضرت علیؑ کے ماننے والے آپ کی پیدائش کے دن ایک جگہ جمع ہو جائیں اور کہیں کہ علیؑ وہ فرد ہے جو مسکین و یتیم اور قیدیوں کو اپنا کھانا دے دیا کرتے تھے تو کیا یہ ان کی عبادت کرنا ہے؟ یا ان کی مدح بیان کرنا ہے؟

اگر عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ان آیات کو جن میں حضورؐ کی تعریف کی گئی ہے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کریں یا ان سے شعر موزوں کریں اور وہ اشعار کسی محفل میں پڑھیں تو کیا ان اشعار کا پڑھنا حرام ہوگا؟

کیا یہ کہنا غلط ہے کہ حقیقت میں وہ لوگ جو "بدعت" کے لفظ کو بہانہ قرار دے کر مسلمانوں کو جنابِ رسولِ اکرمؐ اور اولیائے خدا کی تعظیم و تکریم سے روکنا چاہتے ہیں وہ اپنے اس عمل کے ذریعے جنابِ رسولِ خداؐ اور اولیائے خدا سے اپنی دشمنی کا اظہار کر رہے ہیں؟

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ "مذہبی مجالس و محافل" کے خلاف وہابی طبقہ اگر بھرپور انداز سے پروپیگنڈا مہم چلاتے ہوئے ہے اور لوگوں کو بہکانے کے لئے یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اگر واقعاً یہ مجالس اور محافل "مذہبی" ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں اسلام سے تعلق ہے اور اگر ان کا اسلام سے کوئی تعلق ہے تو پھر ضروری ہے کہ آئین اسلام میں خصوصی طور پر یا عمومیت کے ساتھ ان کے جواز میں کوئی حکم موجود ہو گا لہٰذا اگر اس ضمن میں کوئی حکم پیش کیا جائے تو صحیح ورنہ یہ عمل (یعنی ان مجالس اور محافل کا انعقاد) قطعی طور پر بدعت اور حرام تسلیم کرنا پڑے گا؟ تو اس قسم کے سوالات کو سننے کے بعد مسلمانوں کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اس لئے کہ وہابی طبقے نے جو سوال اٹھایا ہے اس کا جواب بالکل آسان ہے وہ اس طرح کہ ہمارے پاس قرآنِ حکیم میں ایسی آیات بکثرت موجود ہیں جن میں جنابِ رسول

خدا (ص) کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی گئی ہے اب کیونکہ یہ مجالس اور محافل درحقیقت اسی احترام ہی کے سلسلے میں منعقد ہوتی ہیں اس لئے انہیں کسی صورت بھی بدعت یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آیئے ہم آپ کو ان دلائل سے آگاہ کریں جن کے پیشِ نظر اس قسم کی مجالس اور محافل کے انعقاد کو قرآنی حکم کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔

پہلی دلیل

قرآن حکیم میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو جناب رسولِ خدا (ص) ، کا احترام کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورۂ اعراف ۔ آیت ۔ ۱۵۷)

ترجمہ :۔

وہ لوگ جو ایمان لاتے اس پر (یعنی رسولِ خدا ص پر) اس کی عزت کی ، اس کی حمایت و نصرت کی اور جنہوں نے پیروی کی اس نور کی جو اس کے ساتھ نازل ہوا ۔ بے شک یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں ۔

مندرجہ بالا آیات کے بیان شدہ جملات یہ ہیں :

۱۔ آمنوا بہ ۲۔ عزّروہ ۳۔ نصروہ ۴۔ واتبعوا النور......

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا جملات کا تعلق صرف پیغمبر اکرمؐ کے زمانے ہی سے ہے ۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان جملات کا تعلق صرف پیغمبر اکرمؐ کے زمانے ہی سے ہے اور "عزّروہ" والا جملہ جس کے معنی تعظیم و تکریم کے ہیں تو قطعی طور پر صرف رسولِ خدا (ص) کے زمانے سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اس عظیم رہبرِ انسانیت کی عزت و تعظیم مسلسل طور پر ہر زمانے میں ہونی چاہیئے ۔ لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ :

کیا میلاد النبیؐ کے موقع پر آپؐ کی شان میں منعقد کی جانے والی مجلسیں ، تقریریں ، شعر خوانی ،

وغیرہ " عزّروہ " کی واضح مثال نہیں ہیں ؟

کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ " وہابی اپنے لیڈروں اور حکام کی تو اس قدر عزت و تعظیم کرتے ہیں جبکہ وہ ایک عام انسان کی طرح ہیں لیکن اگر پیغمبرؐ یا ان کے منبر اور محراب کی اس عزت و احترام کے ہزارویں حصے کے برابر بھی تعظیم کی جائے تو اس کو بدعت اور اسلام کے خلاف عمل قرار دیتے ہیں اور اس طرح تمام دنیا کی قوموں کی نظر میں اسلام کو ایک خشک ؛ احساسات سے عاری مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس شریعت کو جو کہ بہت ہی آسان فطرت اور انسانی جذبات کے مطابق انسان کے لئے قابلِ قبول اور اعلیٰ ہے ایک ایسے خشک آئینِ زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جس میں بزرگوں کی عزت و احترام کے سلسلے میں انسانی جذبات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اور جو دنیا کی مختلف قوموں کو اپنے میں جذب کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ۔

دوسری دلیل

" وہابی " جو کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کی یاد میں منعقد کی جانے والی ہر مجلس اور محفل کے خلاف ہیں ذرا سوچ کر بتائیں کہ ان کا حضرتِ یعقوبؑ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے ؟

اگر عصرِ حاضر میں جناب یعقوب نجدیوں اور " محمد بن عبدالوہاب " کے ماننے والوں کے درمیان زندہ ہوتے تو وہ (وہابی) ان کے بارے میں کیا فیصلہ دیتے ؟

کیا یہ درست نہیں ہے کہ حضرتِ یعقوب اپنے بیٹے حضرت یوسف کے فراق میں دن رات رویا کرتے تھے ، چاہے وہ کسی حال میں کیوں نہ ہوں ہر شخص سے اپنے بیٹے کے بارے میں ضرور سوال کیا کرتے ؟ کیا یہ بھی درست نہیں کہ وہ حضرت یوسف کی جدائی اور غم میں اس قدر روئے کہ قوتِ بینائی ختم ہو گئی ؟

بیماری اور آنکھوں کی روشنی چلے جانے کے بعد بھی یوسف کی یاد دل سے نہیں گئی بلکہ جوں جوں یوسف سے دوبارہ ملاقات کی اُمید بڑھتی گئی بیٹے کی محبت کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا میلوں دور ہونے کے باوجود حضرت یعقوب اپنے بیٹے یوسف کی خوشبو سونگھ لیا کرتے تھے اور بجائے اس کے کہ ستارہ (یوسف) خورشید (یعقوبؑ) کی تلاش میں نکلتا ان کے فکر کا

سورج ہمیشہ اپنے ماہتاب (یوسف) کی تلاش میں رہتا تھا؟

سوچنے کی بات ہے کہ آخر کیونکر ممکن ہے کہ اس قسم کے انسان کی زندگی میں اس (یوسف) سے اظہار محبت نہ صرف صحیح ہو بلکہ توحیدی آئین کے مطابق بھی ہو مگر اس کے مرنے کے بعد جب کوئی انسان اپنے سوز و گداز یا غم و رنج کا اظہار کرے تو اسے حرام اور شرک سے تعبیر کیا جائے۔ یا پھر اگر ہمارے موجودہ زمانے کے یعقوب ہر سال اپنے یوسفوں کی وفات کے دن اپنی اولاد کو اکٹھا کرکے ان کے سامنے اپنے یوسف کی اخلاقی اور نفسیاتی اقدار کے بارے میں تقریریں کریں اور انہیں یاد کرکے آنسو بہائیں تو کیونکر ان کے اس عمل کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے ایسا کرکے اپنی اولاد کی پرستش (یعنی عبادت) کی ہے؟

اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ذوی القربیٰ (اپنے قریبیوں) سے دوستی ان اسلامی فرائض میں شامل ہے جس کی طرف قرآن حکیم میں واضح الفاظ کے ساتھ دعوت دی گئی ہے تاہم سوال یہ ہے کہ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ چودہ سو سال کے بعد مذہبی فرائض کو انجام دے تو اسے کونسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا؟ کیا اس ضمن میں اس کے پاس اس کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ وہ ان (ذوی القربیٰ) کی خوشی کے دن خوشی منائے اور ان کے یوم غم کے موقع پر غمگین ہو؟ اب اگر اس مقصد کے لئے یعنی خوشی کے اظہار کے لئے محافل کا انعقاد کرتا ہے اور ان محافل میں ان کی زندگی اور فداکاری کے بارے میں تقریریں کی جاتی ہیں یا پھر ان کی مظلومیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو کیا اس عمل سے سوائے اس کے کہ اپنے قریبیوں سے دوستی اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے کیا کوئی اور مقصد بھی پورا ہوا ہے؟

اسی طرح اگر کوئی شخص زیادہ محبت کے اظہار کے لئے ان کی زیارت کے لئے جاتا ہے اور ان کی قبروں کے نزدیک مجالس اور محافل منعقد کرتا ہے تو کیا صاحبانِ عقل و بصیرت کی نظر میں اس کا یہ عمل سوائے اظہارِ محبت کے اور کوئی معنی بھی رکھتا ہے۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات میں "وہابی طبقہ" سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ دوستی اور محبت کے اس جذبے کو صرف سینے کے اندر ہی دفن رکھنا چاہیئے اس لئے کہ ان کے نزدیک کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی محبت کا اظہار کر سکے۔۔۔۔!؟

جناب رسولِ خدا (ص) کے زمانۂ حیات اور آنحضور (ص) کے بعد کا زمانہ جو کہ عقائد میں تبدیلی اور افکار میں انقلاب کا زمانہ تھا اس دور میں مختلف اقوام جن کے آدابِ زندگی اور رسم و رواج ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے جونہی کلمہ شہادت پڑھتے انہیں مسلمان تسلیم کر لیا جاتا۔ اس زمانہ میں نہ تو جناب رسولِ خدا (ص) نے اور نہ ہی آنحضور (ص) کے بعد ان کے اصحاب یا کسی دوسرے مذہبی رہبر نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ ان اقوام کے آداب اور رسوم کے بارے میں تحقیق کریں جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا ہے تاکہ بعد میں ان کی تمام رسومات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جا سکے جس کا ان کی پہلی شکل و صورت سے دور کا تعلق بھی نظر نہ آئے۔

بزرگوں کا احترام ان کی یاد میں مجلسیں منعقد کرنا، ان کی قبروں پر حاضری دینا، ان کے لئے اپنی محبت کا اظہار کرنا دنیا کی تمام قوموں میں رائج رہا ہے اور اس وقت بھی مشرق و مغرب کی تمام اقوام اپنے رہبروں کے مومیائی مجسموں اور ان کی قبروں کی زیارت کے لئے گھنٹوں انتظار میں کھڑی رہتی ہیں تاکہ ان کے جسموں اور قبروں کے قریب کھڑے ہو کر ان سے محبت کا اظہار کریں اور ان کی یاد میں آنسو بہائیں جو کہ ان کے احترام و احساساتِ قلبی کا آئینہ دار ہیں۔

اس کے علاوہ تاریخ کی کسی کتاب سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ جناب رسولِ خدا نے دینِ اسلام قبول کرنے والوں کے عقائد کے بارے میں تحقیق کرنے یا ان کے آدابِ زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے مسلمان ہونے کی تصدیق کی ہو بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ جونہی کسی نے کلمہ شہادت پڑھا آنحضور (ص) نے اس کے مسلمان ہونے کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ اگر اس قسم کے آداب زندگی اور رسوم حرام ہوتے یا ان کا شمار بزرگوں کی پرستش میں ہوتا تو پھر کیا یہ ضروری نہ تھا کہ اسلام قبول کرنے والوں سے بیعت کے ذریعے پہلے اس قسم کی رسوم سے دوری کا عہد لیا جاتا پھر ان کے مسلمان ہونے کی تصدیق کی جاتی؟ حالانکہ تاریخ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ موجود نہیں۔

تیسری دلیل

قرآنِ حکیم کی تلاوت کے دوران یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے خداوند

عالم سے آسمانی خوان نازل فرمانے کی درخواست کی تھی اور اس کے نزول کے دن کو عید کا دن قرار دیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں حضرت عیسیٰ کی دعا کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔

(سورۃ مائدہ - آیت - ۱۱۴)

ترجمہ:

خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔

کیا پیغمبر اکرم (ص) کے وجودِ مبارک کی قدر و قیمت آسمانی خوان سے بھی کم ہے جس کے نازل ہونے کے دن کو حضرت عیسیٰ (ع) عید کا دن قرار دیتے ہیں اگر اس دن عید منانے کی وجہ وہ طعام آیتِ الٰہی تھا تو کیا رسولِ اکرمؐ عظیم ترین آیتِ الٰہی نہیں ہیں؟

چوتھی دلیل

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (سورۃ الم نشرح - آیت - ۴)

ترجمہ:

اور ہم نے تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا ہے۔

لہٰذا سوچنے کا مقام ہے کہ کیا جناب رسول مقبول (ص) کے یوم ولادت کے موقع پر مجالس و محافل کا انعقاد اس ذکر کو باقی رکھنے کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی رکھتا ہے؟ آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ذکرِ رسول (ص) کے سلسلے میں قرآن حکیم کی پیروی کو اہمیت نہ دیں وہ بھی اس صورت میں جبکہ ہمیں اس امر کا علم حاصل ہے کہ ہمارے لئے قرآن سے بڑھ کر عمل کے لئے اور کوئی بہترین معیار اور نمونہ ہے ہی نہیں!

اولیاء اللہ کے آثار سے برکت حاصل کرنا خواہ زندہ ہوں یا مردہ شرک نہیں ہے

وہابی اولیاء اللہ کے آثار سے برکت حاصل کرنے کو شرک سمجھتے ہیں اور ہر اس شخص کو جو محراب، منبرِ پیغمبر اکرم (ص) کو چومتا ہے مشرک سمجھتے ہیں خواہ وہ ان کی خدائی کا قائل ہی نہ ہو بلکہ پیغمبر (ص) سے محبت کی وجہ سے آپ کے آثار کو بوسہ دیتا ہو لیکن یہ لوگ یوسف کے کرتے کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

یوسف کہتے ہیں کہ میرا کرتا لے جاؤ اور میرے والد کے سامنے ڈال دو تاکہ وہ دوبارہ اپنی بینائی حاصل کریں۔ حضرت یعقوب نے بھی یوسف کے کرتے کو جو کہ کسی خاص طریقے سے نہیں بنایا گیا تھا، اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہیں اور اسی وقت ان کو بینائی مل جاتی ہے اگر حضرت یعقوب، نجدیوں، اور محمد بن عبد الوہاب کے ماننے والوں کے سامنے ایسا کوئی کام کرتے تو ان کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے؟ اور گناہ و خطا سے محفوظ معصوم پیغمبروں کے عمل کی کیا تعریف کرتے؟

(حضور (ص) کے زمانے سے لے کر آج تک وہابیوں کے علاوہ تمام مسلمان آپ کے آثار سے فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ شیخ محمد طاہر مکی نے ایک مقالے میں جو کہ ۱۳۸۵ میں شائع ہوا اس سلسلے میں تاریخی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ اس مقالے کا نام "تبرک الصحابۃ بآثارِ رسول اللہ (ص)" ہے اور اس مقالے کا ترجمہ فارسی میں بھی ہو چکا ہے)۔

اب اگر مسلمان خاتم النبیؐ کی قبر کی خاک کو اپنی آنکھوں سے ملتے ہیں اور اس کو احترام کے طور پر بوسہ دیتے ہیں یا اس سے فیض حاصل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے اس قبرِ مبارک کی خاک کو تاثیر عطا کی ہے اور اس عمل میں یعقوبِ زمان کی پیروی کرتے ہیں تو کیونکر ان کی ملامت کی جاتی ہے اور کیونکر انکے خلاف کفر کا فتویٰ دیا جاتا ہے؟

باب ۸

"عبادت اور پرستش میں توحید"

اللہ کے فرستادہ انبیاؑ کی دعوت ہر دور میں "یکتا پرستی" پر مبنی رہی ہے یعنی تمام انبیائے کرام نے بنی نوع انسان کو اسی امر کی طرف متوجہ کیا کہ وہ (انسان) صرف اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک ہی کی عبادت کریں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش سے پرہیز کریں۔

دوگانہ پرستی کی زنجیروں کو توڑنے کے سلسلے میں یکتا پرستی احکاماتِ الٰہیہ میں بنیادی حیثیت کا درجہ رکھتی ہے اور انبیائے خدا کے کارناموں میں اسی "یکتا پرستی" ہی کو اوّلیت حاصل رہی ہے یعنی تمام انبیائے برحق کا مقصد ایک ہی تھا چنانچہ سب نے انسانوں کو عبادت کے سلسلے میں یکتا پرستی کو اختیار کرنے کی دعوت دی اور شرک کو نابود کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید میں واضح الفاظ کے ساتھ بیان

کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ :۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔

(سورۂ نحل ۔ آیت ۔ ۳۶)

ترجمہ:

"ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ۔

(سورۂ انبیاء آیت ۲۵)

ترجمہ:

ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

۲۔ قرآن مجید میں تمام آسمانی شریعتوں کے درمیان مشترک حقیقت یکتا پرستی کو قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا

(سورۂ آل عمران ۔ آیت ۶۴)

ترجمہ:

کہو "اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا ربّ نہ بنا لے۔

عبادت میں توحید ایک مسلّمہ اور مستحکم حقیقت ہے کوئی بھی مسلمان اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کے تمام گروہ اس کے بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ معتزلہ "توحید افعالی" کے بارے میں اختلافِ نظر رکھتے ہیں یا پھر "اشاعرہ" "توحید صفات"

کے بارے میں خاص نظریہ رکھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے تمام فرقے اس اصل کے بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں اور کوئی بھی مسلمان اس اصل کا منکر نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو صرف مثالوں سے متعلق ہے یعنی کچھ مسلمان کچھ اعمال کو عبادت سمجھتے ہیں جبکہ دوسرے اسی عمل کو تعظیم و تکریم سمجھتے ہیں اس لحاظ سے جو بھی اختلاف نظر آئے وہ صغریٰ میں ہے یعنی فلاں کام عبادت ہے یا نہیں کبریٰ میں کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی یہ کہ غیر خدا کی عبادت شرک و حرام ہے ہم اس مقام پر سب سے پہلے یہ بتانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ عبادت کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اور قرآن حکیم میں یہ لفظ کس کس معنی میں استعمال ہوتا ہے تاکہ حقیقت امر کو آسانی کے ساتھ واضح کیا جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں ہم زیادہ واضح طور پر یہ کہہ سکیں کہ عبادت میں "توحید" ایک ایسی بات نہیں ہے جسے ایک خاص گروہ ہی خصوصیت کے ساتھ اہمیت دیتا ہے بلکہ تمام مسلمان جو توحید پرست ہیں ان سب کا اس سلسلے میں ایک جیسا عقیدہ ہے ہم عبادت کے لغوی معنیٰ کی وضاحت کے بعد جس اہم مسئلے کو موضوع بحث قرار دیں گے وہ ان اعمال سے متعلق ہے جنہیں بعض فرقوں نے عبادت سے تعبیر کیا ہے جبکہ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان اعمال کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔

عبادت کی حدود اور اسکی مکمل تعریف

عربی کا لفظ "عبادت" فارسی کے لفظ "پرستش" کا ہم معنی ہے جس طریقے سے لفظ "پرستش" فارسی زبان والوں کے لئے واضح ہے اسی طرح "عبادت" عربی زبان والوں کیلئے بھی واضح ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک جملے میں اس لفظ کی تعریف ممکن نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ زمین و آسمان جیسے الفاظ ہمارے لئے مکمل طور پر واضح ہیں جبکہ بہت سے لوگ مکمل طور پر ان الفاظ کی تعریف بیان نہیں کر سکتے لیکن اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان الفاظ کو سننے کے بعد ان سے مراد چیزیں ہمارے لئے واضح نہیں ہوتیں عبادت اور پرستش کے الفاظ بھی زمین و آسمان جیسے الفاظ کی طرح ہیں سب ان کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ان الفاظ کے معانی یا پھر ان کی منطقی تعریف کو بیان کرنا ہمارے لئے مشکل امر بن جائے۔ ایک عاشق اپنے معشوق کے گھر کے در و دیوار کو چومتا ہے

اور اس کے لباس کو اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے یا اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کے بوسے لیتا ہے لیکن کسی بھی قوم میں اس عاشق کو معشوق کا پجاری نہیں کہا جاتا دنیا بھر کے بڑے بڑے لیڈروں کے مردہ مومیائی جسموں ان کے آثار اور محلوں کو دیکھنے کے لئے جانا اور ان کے احترام میں چند لمحے خاموش رہ کر خراج عقیدت ادا کرنے کا شمار عبادت و پرستش میں نہیں ہوتا خواہ ان لیڈروں کا احترام کرنے والوں میں ان کی محبت وغیرہ اسی قدر ہو جیسی محبت ایک خدا پرست کے دل میں اپنے معبود کے لئے ہوتی ہے ہماری موجودہ بحث صرف اور صرف باضمیر اور ان منصف مزاج افراد کے لئے ہے جو بیدار ہیں اس لئے کہ باضمیر اور بیدار افراد ہی اس گفتگو سے استفادہ کرتے ہوئے احترام، تعظیم، عبادت اور پرستش کے مفہوم میں فرق کر سکتے ہیں۔

جبکہ وہ افراد جنہوں نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان کے لئے "عبادت" کی منطقی تعریف بیان کی جائے اور ان کے سامنے اس لفظ کا مکمل طور پہ تجزیہ پیش کیا جائے۔ انہیں ہم صرف اتنا بتانے پر ہی اکتفا کریں گے کہ لفظ عبادت کی درج ذیل تین طریقوں کے ذریعے تعریف بیان کی جا سکتی ہے۔

لفظ عبادت کی پہلی تعریف

عبادت، عملی یا لفظی اور زبانی خضوع کا نام ہے جو کہ عبادت کرنے والے کے اعتقادی لحاظ سے اس کی "الوہیت" سے پیدا ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "الوہیت" کے کیا معنی ہیں؟ اور بحث کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ "الوہیت" کی صحیح تعریف کی جائے۔ الوہیت کے معنی "خدائی" اور الٰہ کے معنی خدا کے ہیں اگر کسی وجہ سے "الٰہ" کی تفسیر معبود کی گئی ہے تو یہ تفسیر لازم ہے کیونکہ معبود واقعیٔ "الٰہ" نہیں ہے اس تصور کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی قوموں کے درمیان حقیقی الٰہ اور تمام تصوری الٰہ کو معبود سمجھا گیا اور ان کی پرستش کی گئی چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ "الٰہ" کے معنی معبود کے ہیں جبکہ معبود ہونا الٰہ کے معنی کے لوازمات میں سے ہے نہ کہ اس کے بنیادی اور ابتدائی معنی ہیں۔

اس دلیل کا واضح ثبوت کہ لفظ "الٰہ" کے معنی "خدا" کے ہیں نہ معبود کے خود کلمہ اخلاص یعنی لا الٰہ الا اللہ ہے اگر اس جملے میں "الٰہ" کے معنی معبود کے ہوں تو مذکورہ کلمہ جھوٹا ہو جائے گا کیونکہ ... واضح ہے

کہ "اللہ" کے سوا ہزاروں دوسرے معبود بھی ہیں۔

اس تعریف کے ثبوت میں اور دوسری آیات بھی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عبادت اس روش و کردار کا نام ہے جو عبادت کرنے والے کے اعتقاد "الوہیت" (بتوں کو خدا بنا لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قطعی طور پر خالق و منتظم اور انسان و جہان کے مدبر ہیں بلکہ خدا ہونا وسیع معنی کا حامل ہے جس میں اصلی اور جھوٹے خدا دونوں ہی شامل ہیں جب بھی کسی ہستی کو خدائی کاموں کا مبداء تصور کریں گے اور سمجھیں گے کہ کچھ خدائی کام یعنی شفاعت اور مغفرت وغیرہ ان کے اختیار میں ہے تو یقیناً اس ہستی کو خدا تصور کیا ہے۔ البتہ یہ کام خداوند تعالےٰ کے مقابلے میں ایک جھوٹے خدا کا تصور ہوگا.....) کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کسی موجود ہستی کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد نہ ہو تو اس کی تعظیم و تکریم اور اس کے سامنے جھکنے کو عبادت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب قرآن خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے تو اس کے فوراً بعد دلیل لائی جاتی ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں ہے۔

یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (اعراف : ۵۹) اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

اس آیت سے ملتا جلتا مضمون تو یا اس سے بھی زیادہ جگہ آیا ہے اس کتاب کے پڑھنے والے اس سلسلے میں سورہ اعراف کی آیات ۶۵، ۷۳، ۸۵ سورہ ہود کی آیات ۵۰، ۶۱، ۸۴ سورۂ انبیا کی آیت ۲۵۔ سورہ مومنون کی آیات ۲۳، ۳۲ اور سورہ طہٰ کی آیت ۱۴ کا مطالعہ کر سکتے ہیں ان دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ عبادت وہ خضوع اور تذلیل ہے جو "الوہیت" کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے اگر کوئی اعتقاد ہی نہ ہو اور یونہی کوئی کام کیا جائے تو اس کو عبادت نہیں کہتے۔

نہ صرف مذکورہ بالا آیت بلکہ دوسری آیات بھی اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں مثال کے طور پر

اِنَّهُمْ كَانُوا اِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُونَ (صافات - ۳۵) یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے یعنی اس بات کی جانب توجہ نہیں کرتے تھے کیونکہ دوسری ہستیوں کو خدا سمجھتے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ

(سورۂ - طور - آیت - ۴۳)

کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں، اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں (اس سلسلے میں سورہ توبہ آیت ۳۱ اور سورہ نمل آیت ۶۳ بھی دیکھئے)

مذکورہ آیت میں شرک کا معیار یہ ہے کہ غیر خدا کی خدائی کے معتقد ہو جائیں۔

اَلَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (سورۂ حجر - آیت - ۹۶)

جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ (سورہ فرقان - آیت ۶۸)

اور اس بات کے ثبوت میں کہ مشرکین ہمیشہ اپنے بتوں کی خدائی کی دعوت دیا کرتے تھے، مندرجہ ذیل آیت بیان کی گئی ہے۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا

(سورہ مریم - آیت - ۸۱)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے خدا بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے پشتبان ہوں۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ آلِهَةً اُخْرٰى

(سورۂ انعام - آیت - ۱۹)

کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ لِاَبِيهِ آزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا آلِهَةً

(سورۂ انعام - آیت - ۷۴)

ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا، کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے۔

ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں بت پرستوں کے مسئلہ شرک کو بیان کیا گیا ہے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بت پرستوں کا شرک ان کے اپنے معبودوں کی الوہیت پر اعتقاد تھا ان چیزوں کو جو مخلوق خدا تھیں خدا کی طرح سمجھتے تھے اور اس کے باوجود کہ وہ مخلوق خدا تھیں۔ خداوند تعالیٰ کے کچھ کاموں کا تعلق ان سے بیان کیا جاتا تھا اور اسی وجہ سے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔

اپنے خدا کی الوہیت پر اعتقاد ہی کی وجہ سے جب بھی انہیں خدائے واحد کی عبادت کی جانب دعوت دی جاتی تھی اس کے منکر ہو جاتے تھے اور اگر اس کے لئے کہ شرک [illegible]

ایمان لے آتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا
فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ

(سورۂ غافر آیت - ۱۲)

یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے۔

مرحوم آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی اپنی قابلِ قدر تفسیر "آلاء الرحمان" میں جب عبادت کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

اَلْعِبَادَةُ مَا يَرَوْنَهُ مُشْعِرًا بِالْخُضُوعِ لِمَنْ يَتَّخِذُهُ الْخَاضِعُ
إِلٰهًا لِيُوَفِّيَهِ بِذٰلِكَ مَا يَرَاهُ لَهُ مِنْ حَقِّ الْاِمْتِيَازِ بِالْاِلٰهِيَّةِ

عبادت وہ عمل ہے جس میں انسان اس شے کے مقابلے میں جس کو خدا تسلیم کرتا ہو خضوع کرے تاکہ اس طریقے سے اس کی عظمت والوہیت کا اعتراف کرے۔ (آلاء الرحمان ص ۵۷)

مرحوم بلاغی نے اپنی وجدانی کیفیات کے ذریعے عبادت کے معنی بیان کئے ہیں۔ مذکورہ بالا آیات مکمل طور پر اس تعریف کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

جناب حضرت آیت اللہ العظمٰی خمینی نے بھی اپنی قابلِ قدر کتاب میں اسی تعریف کو پسند فرمایا ہے۔ تعریف یہ ہے۔

عربی میں لفظ "عبادت" اور فارسی میں "پرستش" کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے طور پر کسی کی ستائش کریں۔ خواہ یہ ستائش خداوند عالم کی ہو یا کسی بنائے ہوئے خدا کی (کشف الاسرار۔ ص - ۲۹)

مذکورہ بالا نظریات کا واضح ترین ثبوت وہ آیات ہیں جن میں شرک کے خلاف جدوجہد کرنے کی تاکید کر کے بتایا گیا ہے کہ تمام مشرک گروہ تمام موجودات کو "الٰہ" تصور کرتے تھے اور ان کے سامنے خضوع اور ان کی ستائش کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں خود کو حقیر خیال کرتے تھے۔

عبادت کی دوسری تعریف:

عبادت اس کے سامنے جس کو رب "سمجھتے" ہیں خضوع کا نام ہے۔ لفظ عبادت کے معنی کو دوسرے الفاظ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یعنی عبادت اس لفظی یا عملی خضوع کا نام ہے جو کہ عبادت کرنے والے کے اعتقادِ ربوبیت سے شروع ہوتا ہے جب بھی کوئی انسان خود کو عبد اور غلام اور مقابل کو اپنا رب تصور کرے، چاہے وہ اس کا رب ہو یا نہ ہو لیکن رب سمجھ کر اس کے سامنے خضوع کرے تو اس عمل کو عبادت کہا جائے گا۔

مندرجہ ذیل آیات کے ذریعے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ عبادت ربوبیت کے طریقوں میں سے ہے۔

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ

(سورہ مائدہ - آیت ۷۲)

حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ

(سورۂ آلِ عمران - آیت - ۵۱)

"اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اُس کی بندگی اختیار کرو یہی سیدھا راستہ ہے" یہی مضمون دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے اور کچھ آیات میں عبادت کو خالقیت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت میں۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ

(سورۂ انعام - آیت - ۱۰۲)

یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے وہ ہر چیز کا خالق ہے لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو"

لفظ "رب" کے کیا معنی ہیں؟

"عربی میں رب" اس کو کہا جاتا ہے جس کے ذمے کسی چیز کی تدبیر و ہدایت ہو یا وہ اس چیز کے مقدر کا مالک ہو اور اگر عربی میں گھر کے مالک، ماں اور کسان کو رب کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی چیزوں پر مکمل اختیار ہے اور ان کی تقدیر اُن کے ہاتھ میں ہے اگر ہم خدا کو اپنا رب مانتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تقدیریں وجود ہستی، زندگی اور موت، روزی و رزق، بخشش وغیرہ سب اس کے ہاتھ میں ہیں یعنی مثال کے طور پر اگر یہ تصور کیا جائے کہ خدا نے زندگی و موت یا رزق اور مغفرت وغیرہ کا مکمل اختیار کسی دوسرے کو سونپ دیا ہے لہٰذا ہم اس تصور کے تحت اس (غیر خدا) کو مذکورہ تمام امور یا ان میں سے بعض کا مستقل طور پر ذمہ دار تسلیم کریں تو گویا ہم نے اسے رب سمجھا ہے اور اسی عقیدہ کے تحت جب اس کے سامنے خضوع کریں گے۔ تو پھر یہ خضوع اسی کی عبادت اور پرستش کہلائے گا یعنی عبادت و پرستش کی ابتدا کسی کی بندگی کے احساس سے ہوتی ہے اور حقیقتِ بندگی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انسان خود کو غلام اور مدِ مقابل کو اپنے وجود، ہستی، زندگی، موت رزق کا مالک و مختار یا کم از کم مالکِ مغفرت و شفاعت اور مقنن (قانون بنانیوالا) تسلیم کرے اب اگر کوئی اس قسم کے احساس کی بنا پر زبان یا عمل سے اس عقیدہ کو مجسم کرے اور اپنے احساس کو عملی جامہ پہنائے تو اس نے بیشک پرستش اور عبادت کی ہے۔

عبادت کی تیسری تعریف

"کسی ایسی ہستی کے مقابلے میں جس کو خدا یا خدائی کاموں کا مبداء تصور کرتے ہیں، خضوع کا نام عبادت ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ وہ کام جن کا تعلق جہانِ خلقت و آفرینش سے ہے خدا کی ملکیت ہیں۔ مثال کے طور پر امورِ دنیا کے بارے میں تدبیر، انسانوں کو زندہ کرنا، موت، جانداروں کو رزق فراہم کرنا، مغفرت و بخشش وغیرہ۔ اگر ان امور سے متعلق آیات کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ قرآن میں تاکیداً ان کاموں کو خدا کے کام بتایا گیا ہے اور ان کاموں کو دوسروں سے نسبت دینے کی سختی سے

ممانعت کی گئی ہے۔ لہٰذا اس ناقابلِ انکار حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اگر ہم اس امر کی طرف بھی توجہ دیں کہ جہانِ آفرینش میں ایک نظم موجود ہے اور پھر وہ بات جو اس دنیا میں ہوتی ہے بغیر کسی خدائی نسبت کے ظہور میں نہیں آتی چنانچہ قرآن مجید میں بھی ان اسباب کو بیان کیا گیا ہے جو کہ خود بخود وجود میں نہیں آتے بلکہ اس کے حکم سے ظہور میں آتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں خاص تاکید کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مارنے اور زندہ کرنے والا خدا ہی ہے

وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

(سورۂ مومنون۔ آیت ۸۰)

"وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں"

لیکن یہی قرآن دوسری آیات میں فرشتوں کو جان نکالنے کا وسیلہ بھی بیان کرتا ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا

(سورۂ انعام۔ آیت ۶۱)

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں چنانچہ یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان قدرتی وجوہات کے اسباب خواہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی جیسے فرشتے وغیرہ خدا کے حکم و دستور و فرمان سے عمل کرتے ہیں اور یہ قرآنی تعلیمات کا ایک اعلیٰ حصہ ہے کہ بے شمار آیات کے مطالعہ سے خداوند تعالیٰ کے کاموں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص خدائی کاموں کو خدا سے الگ تصور کرے اور کہے کہ یہ کام موجوداتِ نورانی مثلاً فرشتوں اور اولیاء کو سونپے گئے ہیں اور اس اعتقاد سے ان کے سامنے خضوع کرے تو مسلّم طور پر اُس کا خضوع کرنا، عبادت اور خود یہ عمل عبادت میں شرک کے مساوی ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں اگر کوئی اس بات کا معتقد ہو جائے کہ خداوند عالم نے ان کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری فرشتوں کو سونپ دی ہے اور فرشتے آزادانہ طور پر یہ کام کرتے ہیں تو اس صورت میں اُس نے فرشتوں کو "خدا کی طرح" بنا دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعتقاد شرک ہے اور اس اعتقاد کی بنا پر ہر قسم کی درخواست اور خضوع، خدا کے علاوہ دوسری چیزوں کی پرستش اور عبادت ہوگی جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔

(سورۂ بقرہ - آیت - ۱۶۵)

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جتنی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے۔"

فکر انسانی میں کوئی بھی ہستی، "خدا کی طرح" نہیں ہو سکتی لیکن یہ کہ اپنے کاموں میں مستقل اور تمام الاختیار ہو اگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ خدا کے حکم سے تمام کام انجام دیتا ہے تو نہ صرف یہ کہ "خدا کی طرح" نہیں ہوگا بلکہ خدا کا مطیع ہوگا۔ جو اس کے حکم سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔

اتفاق سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مشرکین اپنے خداؤں کے لئے خدائی کام انجام دینے کے سلسلے میں ایک قسم کی آزادی کے معتقد تھے۔

جاہلیت کے زمانے میں ادنیٰ شرک یہ تھا کہ کچھ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ قانون گزاری کا حق مسیحی اور یہودی علماء کو ہی سونپا گیا ہے اور ان کو اس سلسلے میں پوری آزادی حاصل ہے اسی لئے شفاعت سے متعلق تمام آیات میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ بغیر خدا کے حکم کے کسی کو شفاعت کا حق حاصل نہیں ہے اگر ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کے معبود خدا کے حکم سے شفاعت کریں گے تو پھر خدا کے حکم سے شفاعت کی بات سے انکار کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

کچھ یونانی فلاسفر دنیا کے ہر کام کے لئے الگ الگ خدا کا تصور رکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ ان کاموں کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے جب کہ دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر خدا کا کام ہے زمانہ جاہلیت کے وہ عرب جو ستاروں وغیرہ کی پرستش کرتے تھے ان کے اس تصور کی وجہ یہ تھی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جہانِ خلقت اور انسان کے کاموں کی تدبیر ان ستاروں وغیرہ کو سونپی گئی ہے اور خداوند عالم اس سلسلے میں تدبیر کرنے سے معزول کر دیا گیا ہے اور یہ ستارے پورے اختیارات کے ساتھ جہان کی تدبیر کے مالک ہیں اس نقطۂ نگاہ سے ہر قسم کا خضوع وغیرہ جو کہ اس احساس کو ظاہر کرے، عبادت و پرستش ہوگا۔

(دیکھئے الملل والنحل ج - ۲ - ص ۲۴۴)

دورِ جاہلیت کے دوسرے عرب بھی جو کہ لکڑی اور دھات وغیرہ کے بتوں کو اپنا خالق نہیں مانتے

تھے اور ان کو دنیا کو چلانے والا نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی ان کو صاحبِ مقامِ شفاعت خیال کرتے تھے اور کہتے تھے "هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا ... عِنْدَ اللّٰهِ" یہ خدا کے سامنے ہمارے شفیع ہیں،

(دیکھئے سورۂ یونس - آیت ۱۸)

اسی غلط خیال کی وجہ سے کہ یہ جھوٹے خدا مقامِ شفاعت کے مالک ہیں ان کی پرستش کرتے اور ان کی پرستش کو درگاہِ الٰہی سے تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط

(سورۂ زمر آیت ۳۰)

"ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔"

مختصر یہ کہ ہر وہ عمل جو اس قسم کے احساس کا نتیجہ ہو اور جس میں ایک قسم کی تسلیم و رضا کا پہلو ہو تو اس کو عبادت کہا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں ہر وہ عمل جو اس قسم کے احساس کا نتیجہ نہ ہو اور اگر کوئی شخص اس قسم کے اعتقاد کے بغیر کسی ہستی کے سامنے خضوع کرے یا اس کی تعظیم کرے تو یہ عبادت نہیں ہوگی اور اس کا شمار شرک میں نہیں ہوگا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اس عمل کو حرام قرار دیا جائے۔

مثال کے طور پر عاشق کا معشوق کو، محکوم کا حاکم کو اور بیوی کا شوہر کو سجدہ کرنا عبادت نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام میں ان سجدوں کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ بغیر خدا کے حکم کے کوئی بھی کسی کی اس قسم کی عبادت نہیں کر سکتا یاد رہے یہاں عبادت سے مراد عبادت کی ظاہری شکل ہے۔

نتیجۂ بحث

اب جبکہ ہم کافی حد تک "عبادت" اور "شرک" کے حقیقی مفہوم کو واضح کر چکے ہیں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا بحث کا دقت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی انسانوں کے ساتھ خضوع اور تواضع سے پیش آئے بشرطیکہ وہ ان افراد کو "اِلٰہ" یعنی معبود کا درجہ نہ دے اور نہ ہی ان کو "رب" یا خدائی کاموں کا "مبدا" تصور کرے بلکہ ان کا اس نظریہ سے احترام کرے کہ،

عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ

(سورۂ انبیاء - آیت - ۲۶)

یہ وہ بندے ہیں جنہیں عزت بخشی گئی ہے اس لئے کہ یہ لوگ اس (اللہ) کے حضور بڑھکر بات نہیں کرتے بلکہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

تو ایسی صورت میں قطعی طور پر اس قسم کا عمل سوائے تعظیم، عزت اور تواضع کے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

خداوندِ عالم نے قرآنِ حکیم میں اپنے کچھ بندوں کا ذکر ان کی کچھ صفات کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر شخص ان بندوں کا احترام کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔

(سورۂ آلِ عمران - آیت - ۳۲)

ترجمہ:

اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام عالمین پر ترجیح دے کر انہیں (اپنی رسالت کے لئے) منتخب کیا۔

اسی طرح جب خداوندِ عزوجل نے حضرتِ ابراہیم کو "انسانوں" کی امامت کے لئے منتخب کیا تو ارشاد ہوا۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورۂ بقرہ - آیت - ۱۲۴)

اور کہا - میں تمہیں لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔

خداوندِ عزوجل نے قرآنِ حکیم میں حضرت نوح، حضرتِ ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور جناب سرکار رسالت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ان کی کچھ اعلےٰ صفات کے ساتھ کیا ہے اور یہ وہ صفات ہیں جو ہر انسان کو ان کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں ان ذواتِ مقدسہ کی محبت کو وجود دلانے کا باعث ہیں اور شاید اسی لئے قدرت نے بعد میں ان میں سے چند کی محبت کو انسانوں کے لئے لازمی قرار دے دیا۔

اگر تمام انسان ان خدا کے بندوں کا خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ اس لحاظ سے کہ یہ خدا کے عزیز

بندے ہیں احترام کریں لیکن یہ خیال نہ کریں کہ وہ خدا یا خدائی کاموں کا مبداء ہیں تو کوئی بھی شخص یا قوم اس احترام کو پرستش اور اس عمل کے کرنے والے کو مشرک نہیں کہے گی۔

تمام مسلمان جانتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے حج کے دوران سنگِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں جو کہ ایک سیاہ پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خانۂ خدا کا طواف کرتے ہیں جو کہ اینٹ اور پتھروں کے علاوہ اور کچھ نہیں، صفا و مروہ نامی دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑتے ہیں یعنی وہی کام انجام دیتے ہیں جو کہ بت پرست اپنے بتوں کے سلسلے میں انجام دیتے تھے لیکن ابھی تک کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس عمل سے ہم اینٹوں اور پتھروں کو پوجتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اینٹ اور پتھروں کو پوجنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن اگر یہی عمل اس اعتقاد کی بنا پر ہوتا کہ یہ اینٹ پتھر اور پہاڑیاں خدا یا آثار خدائی کا مبداء ہیں تو یقیناً بت پرستوں کی صف میں ہوتے اس لئے پیغمبر، امام یا معلم استاد، باپ یا ماں کے ہاتھ یا قرآن، مذہبی کتابوں، روضہ کی جالی یا ہر اس چیز کو بوسہ دینا جس کا تعلق خدا کے نیک بندوں سے ہے صرف عزت و احترام ہے۔

فرشتوں کا آدم کو اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا حضرت یوسف کو سجدہ کرنے کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے (دیکھئے سورۂ بقرہ - آیت ۳۴ - اور سورۂ یوسف - آیت - ۱۰۰)

لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ فرشتوں یا حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا یہ عمل آدمؑ اور حضرت یوسفؑ کی پرستش تھی، وجہ یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے اپنے مسجود کے بارے میں "الوہیت" کا معمولی سا بھی شائبہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ان کو خدائی کاموں کا مبداء تصور کرتے تھے اس وجہ سے ان کا یہ عمل صرف تعظیم و تکریم تھا نہ عبادت یا پرستش۔

وہابیوں کے سامنے جب یہ آیات لائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ عمل مسجود کی پرستش نہیں ہے کیونکہ خود خدا نے اس بات کا حکم دیا تھا۔

لیکن وہابی جس نکتہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ اعمال حتیٰ یعقوب علیہ السلام کے سامنے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا عمل بھی خدا کے حکم اور اس کی مرضی سے تھا لیکن خود اس عمل کا مقصد بھی عبادت یا پرستش نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اس کا حکم دیا اور اگر

عمل کی حقیقت مسجود کی ذات کی عبادت ہوتی تو خداوندِ عالم کسی بھی صورت میں اس کا حکم نہیں دیتا

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔

(سورۃ اعراف آیت - ۲۸)

ترجمہ :

ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے (وہ اللہ کی طرف سے ہیں)؟

○

باب ۹

اولیائے خدا سے ان کی حیات میں مدد طلب کرنا

ذیل میں وہ مختلف صورتیں بیان کی جاتی ہیں جن کے مطابق اولیائے خدا سے مدد طلب کی جاتی ہے یا کسی مسئلے کے بارے میں درخواست اور التجا کی جاتی ہے۔

۱۔ کسی زندہ شخص سے درخواست کریں کہ ایک مکان بنانے کے سلسلے میں ہماری مدد کرے یا پانی کے اس پیالے سے جو اس کے پاس ہے ہماری پیاس بجھائے۔

۲۔ کسی زندہ شخص سے یہ درخواست کریں کہ ہمارے حق میں دعا کرے اور خدا سے ہمارے گناہوں کی معافی چاہے یہ دونوں صورتیں اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ اس شخص سے جس سے سوال کیا جارہا ہے اس چیز کی درخواست کریں جو سو فیصد اس کے اختیار میں ہو۔ مذکورہ بالا پہلا سوال دنیاوی کاموں اور دوسرا دینی امور سے متعلق ہے۔

۳۔ کسی زندہ شخص سے درخواست کریں کہ فطری اور طبعی وجوہات کے بغیر کسی کام کو انجام دے۔ مثال کے طور پر بغیر علاج کے کسی بیماری سے شفا بخشے۔ بغیر تلاش کے کسی کھوئے ہوئے شخص کو ملوا دے یا ہمیں قرض سے چھٹکارا دلائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ درخواست کریں کہ فطری اور طبعی وجوہات کے بغیر اعجاز و کرامت ہی سے ہمارے کام پورے ہو جائیں۔

۴۔ آپ کی بات پوری کرنے والا زندہ نہیں ہے لیکن کیونکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ اس دنیا میں زندہ ہے اور اپنا رزق وہاں کھا رہا ہے تو اس قسم کے فرد سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے حق میں دعا کریں۔

۵۔ ایسے کسی شخص سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی خداداد معنوی قدرت سے ہمارے بیمار کو شفا عطا کرے، ہمارے کھوئے ہوئے کو ملوائے وغیرہ۔۔۔۔۔۔

مذکورہ بالا دو صورتیں دوسرے اور تیسرے سوال کی طرح ایک زندہ ہستی سے درخواست ہے۔ ان دو صورتوں میں درخواست، بظاہر ایک مردہ شخص سے کی جا رہی ہے لیکن حقیقت میں وہ زندہ ہے۔ کسی بھی طرح ایسے کسی شخص سے درخواست نہیں کی جا سکتی جو مادی درخواستوں کے سلسلے میں عام ذرائع سے ہماری مدد کرے کیونکہ ہمارا مفروضہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے کوچ کر چکا ہے اور اب عام طریقے سے ہماری مدد نہیں کر سکتا اس صورت میں یہ پانچ طریقے ہیں جن میں سے تین زندہ ہونے کی اور دو بظاہر مردہ ہونے کی صورت میں ہیں۔

پہلی صورت

عام معاملات میں ایسے زندہ شخص سے جو فطری اور طبعی ذرائع کا مالک ہو مدد کی درخواست کرنا انسانی تمدن کی بنیاد ہے اس دنیا میں انسانی زندگی تعاون کی بنیاد پر ہے اور دنیا کے تمام دانشمند زندگی کے معاملے میں ایک دوسرے سے مدد حاصل کرتے ہیں اور یہ صورت اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی اس پر نکتہ چینی نہیں کرتا۔ کیونکہ ہماری بحث ایک قرآنی بحث ہے اس لئے قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کافی ہے۔

یاجوج ماجوج کے حملے کے خلاف بند کی تعمیر کے وقت "ذوالقرنین" نے اس علاقے کے

مکینوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (سورۃ کہف - آیت - ۹۵)

دوسری صورت

دنیا میں زندہ فرد سے دعائے خیر اور گناہوں کی معافی کی درخواست

زندہ فرد سے اس قسم کی درخواست کرنا اور اس کا صحیح ہونا قرآن مجید کی ضروریات میں سے ہے جو بھی قرآن مجید سے تھوڑی سی آشنائی رکھتا ہے سمجھ جاتا ہے کہ انبیاءؑ کا یہ طریقہ تھا کہ اپنی امت کی بخشش کی دعا کیا کرتے تھے یا خود امت اپنے انبیاءؑ سے اس قسم کی درخواست کرتی تھی۔ اس سلسلے کی تمام آیات کو ذیل میں بیان کیا جائے گا۔ جو کہ مختلف نوعیت کی ہیں اور سہولت کے لئے مختلف عنوانات میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔

۱۔ کبھی کبھی خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کے گناہوں کی بخشش کے بارے میں دعا کریں۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ"

(سورۃ آل عمران - آیت ۱۵۹)

ان کے قصور کو معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو!

فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ"

(سورۃ ممتحنہ آیت - ۱۲)

ترجمہ:

تو ان سے (عورتوں سے) بیعت لے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کر۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ
إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔

(سورۃ توبہ - آیت - ۱۰۳)

تم ان کے اموال سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انہیں بڑھاؤ اور

ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں خداوند عالم براہ راست پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ان کے حق میں دعا کریں اور نبیؐ کی دعا کی تاثیر اس قدر تیز ہے کہ وہ لوگ پیغمبر کی دعا کے فوراً بعد اپنے دل میں سکون کا احساس کرتے تھے۔

۲۔ کبھی خود پیغمبر گناہ گاروں سے وعدہ کرتے تھے کہ خاص شرائط میں ان کے گناہوں کو معاف کرنے کی دعا کریں گے۔ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ

(سورۂ ممتحنہ - آیت - ۴)

کیا ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اس کے لئے طلب مغفرت کریں گے۔

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔

(کہا ابراہیم نے) میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ وہ تمہیں معاف کردے۔ میرا رب مجھ پر بے حد مہربان ہے۔ (سورۂ مریم آیت ۴۷)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا ان گناہگاروں کو استغفار کا قول دیا کرتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی آذر سے یہی وعدہ کیا تھا لیکن جب انہوں نے آذر کو بت پرستی میں محکم پایا تو ان کی مغفرت سے پرہیز کیا کیونکہ دعا کے قبول ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ جس کے لئے دعا کی جا رہی ہے وہ موحد ہو نہ کہ مشرک۔

۳۔ خداوند حکم دیتا ہے کہ گناہگار لیکن باایمان لوگ خدا سے مغفرت حاصل کرنے لئے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جائیں اور آپ سے درخواست کریں کہ ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور اگر پیغمبر ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور رحیم پائیں گے چنانچہ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے کہ: جب ان لوگوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا تھا اگر (اس وقت) وہ تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے

اس سے زیادہ روشن اور کون سی آیت ہو سکتی ہے جس میں خداوند عالم گناہگار امت کو

خدا سے مغفرت حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ رسول خدا کے پاس جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ ان کے حق میں دعا کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جانے اور آپ سے مغفرت کی دعاؤں کی درخواست کرنے میں دو واضح فائدے ہیں۔

الف: جناب رسول خدا (ص) سے مغفرت کی دعا کی درخواست گناہگار میں اطاعت و پیروی کے جذبے کو زندہ کرتی ہے یہی وجہ اور آنحضور کے مقام کا احساس پیغمبر کی اچھی طرح پیروی کا باعث ہو جاتا ہے۔ اصولی طور پر اس قسم کی آمد و رفت جناب رسول خدا (ص) سے متعلق خضوع کی ایک خاص حالت انسان میں پیدا کرتی ہے اور انسان کو صمیم قلب سے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (سورۂ نساء آیت - ۸۰) کی پیروی کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

ب: مذکورہ عمل جناب رسول اکرم (ص) کے اس مقام و عظمت کو واضح کرنے کے علاوہ جو آنحضور (ص) کو امت مسلمہ کے درمیان حاصل ہے یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح خاص وسیلوں کے ذریعے خدا کے بندوں کو مادی فیض حاصل ہوتا ہے اسی طرح معنوی فیض یعنی مغفرت خدا بھی معین شدہ اسباب کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور ان معین شدہ اسباب میں ہی جناب رسول خدا (ص) اور اللہ کے مقرب بندوں کی دعا بھی شامل ہے۔

جس طرح اگرچہ حرارت اور انرجی (توانائی) کا سبب سورج ہے تاہم اس کا یہ فیض اس کی کرنوں سے انسان تک پہنچتا ہے اسی طرح معنوی فیض اور لطف الٰہی آسمان رسالت کے خورشید درخشاں کے ذریعے ہی انسان کو حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ جہان اور ہستی "اپنے دونوں مرحلوں میں" اسباب اور مسببات" کی دنیا ہے اس لئے دونوں جہانوں میں مادی اور معنوی لطف و کرم کسی سبب کے ذریعے ہی سے حاصل ہوگا۔

۴۔ قرآن مجید میں بعض ایسی آیات موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اکثر (مسلسل) جناب رسول خدا (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور آنحضور (ص) سے طلب مغفرت کیلئے درخواست کیا کرتے تھے یہی نہیں بلکہ جب مسلمان منافقین کو بھی ایسا ہی کرنے کی تجویز پیش کرتے تو انہیں (مسلمانوں کو) منافقین کی طرف سے انکار ہی جواب ملتا تھا۔

قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ
وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ

(سورۂ منافقون آیت - ۵)

ترجمہ:

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول (ص) تمہارے لئے مغفرت کی دعا کرے تو وہ (انکار میں) سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے کتراتے ہیں۔

۵۔ کچھ آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی پاک فطرت سے الہام حاصل کرتے ہوئے یہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں بارگاہِ خداوندی میں انبیائے خدا اور جنابِ رسولِ اکرم (ص) کی دعا خاص اثر رکھتی ہے اور یہ دعا ان کے حق میں سو فیصد قبول ہوتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی پاک فطرت ہی ان کے لئے الہام بخش ہے جو انبیائے خدا کے ذریعے فیوضِ الٰہیہ سے مستفیض ہوتے ہیں یعنی یہ لوگ بالکل اسی طرح اللہ کے فیوض سے مستفیض ہوتے ہیں جس طرح انبیائے خدا کے ذریعے انسانوں کو اللہ کی ہدایت حاصل ہوتی ہے چنانچہ قرآن حکیم نے واضح کیا ہے کہ اس قسم کی پاک فطرت رکھنے والے ہی وہ لوگ ہیں جو انبیائے خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اپنی مغفرت کے لئے دعا کرنے کی درخواست کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ آپ ہمارے حق میں اللہ سے طلبِ مغفرت فرمائیں۔

قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ قَالَ سَوْفَ
أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔

(سورۂ یوسف آیت ۹۷، ۹۸)

ترجمہ:

سب بول اٹھے (حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکے)، ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لئے دعا کریں، واقعی ہم خطا کار تھے۔" اس نے کہا "میں اپنے رب سے تمہارے لئے معافی کی

درخواست کروں گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

۶۔ ایسی بھی آیات ہیں جن میں جناب رسول خدا (ص) کو بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں اور منافقوں کے بارے میں جو کہ ابھی تک بت پرست ہیں ان کی مغفرت کی دعا قبول نہیں ہو گی یہ آیات جو کہ اس سے پہلے کی آیات سے مستثنیٰ ہیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ اس کے علاوہ پیغمبر کی دعائیں خاص اثر رکھتی تھیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (سورہ توبہ - آیت - ۸۰)

ترجمہ:

تم چاہے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لئے یکساں ہے اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
بَنِي إِسْرَائِيلَ۔

(سورۂ اعراف آیت - ۱۳۴)

ترجمہ:

جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ، تجھے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔

مذکورہ بالا آیۂ کریمہ میں قدرت نے واضح کر دیا ہے کہ حضرت موسیٰ بن عمران کی امت کے گناہگار حضرت موسیٰ سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ پھر ان کا یہ کہنا کہ بما عہد عندک اس امر کی دلیل ہے کہ وہ لوگ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ سے اس قسم کا وعدہ کر رکھا ہے اس ضمن میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگر ادع لنا ربک کے اس قول پر جس کے ذریعے حضرت موسیٰ کی امت کے گناہگاروں نے حضرت موسیٰ سے عذاب الٰہی کو دور کرنے کی دعا کرنے کے لئے التجا کی تھی غور و فکر کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جہاں یہ قول

اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت موسیٰ کی اُمت کے لوگ اس بارے میں علم رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ میں وہ طاقت موجود ہے جس کی وجہ سے وہ یعنی حضرت موسیٰ ان سے عذابِ الٰہی کو دور کر سکتے تھے وہاں یہی آیہ کریمہ ان آیات کے ضمن میں آتی ہے جن کا ذکر ہم تیسری دلیل میں کر چکے ہیں (یعنی زندہ افراد سے سوال کرنا صحیح ہے)

۲۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے یہ بات ثابت ہے کہ اہل ایمان مسلسل دوسرے افراد کے لئے دعا کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے کہ

وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا
الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔

(سورہ حشر ۔ آیت ۔ ۱۰)

ترجمہ:

اور (وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ "اے رب! ہمیں اور ہمارے سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ لوگ باایمان افراد کے لئے دعا کرتے ہیں بلکہ اہلِ عرش اور آسمان کے فرشتے بھی اہلِ ایمان کی بخشش کی دعا کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا
فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔

(سُورہ مومن ۔ آیت ۔ ۷)

ترجمہ:

عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم

کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس لئے کیا یہ ہمارے لئے بہتر نہیں ہے کہ ہم بھی ان کی اسی روش کی پیروی کریں اور باایمان لوگوں کے لئے ہمیشہ مغفرت کی دعا کریں؟

تیسری صورت

یہ وہ صورت ہے جس میں ایک ایسی زندہ شخصیت سے جو غیر معمولی کام انجام دینے کی قدرت رکھتی ہے اس سے اس امر کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ کسی کام کو غیر قدرتی طریقے سے انجام دے مثال کے طور پر کسی بیمار کو معجزانہ انداز سے شفا دلائے۔ کسی زمین میں شانِ اعجاز کے ساتھ چشمہ جاری کر دے وغیرہ۔

بعض مسلمان مصنفین نے اس صورت کو بھی درخواست دعا و التجا کی مذکور شدہ دوسری صورت ہی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس قسم کی درخواست کا مطلب اور مقصود یہ ہے کہ کوئی شخص خدا سے کسی بیمار کو شفا عطا کرنے کی دعا کرے یا پھر یہ درخواست کرے کہ خدا غائبانہ امداد کے ذریعے کسی کے قرضے کی ادائیگی کا سبب پیدا کر دے۔ اس لئے کہ اس قسم کے امور کو خدا ہی انجام دے سکتا ہے ہاں البتہ کیونکہ اس دعا میں وسیلہ نبی اکرم (ص) اور امام (ع) ہوتے ہیں اس لئے مجازی طور پر اس خدائی کام کو دعا کرنے والے سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ (دیکھئے کشف الارتیاب ص ۲۷۲)

لیکن قرآنی آیات سے واضح طور پر یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انبیائے خدا اور آئمہ طاہرین (علیہم السلام) سے دعا کی درخواست کرنا قطعاً صحیح ہے اور اس کام کو نہ مجازاً بلکہ واقعاً دعا کرنے والے سے ہی منسوب کرنا بھی صحیح ہے اس لئے کہ ہم اس صورت میں نبی یا امام سے دعا کرنے کی درخواست اس لئے کرتے ہیں کیوں کہ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ معصوم کرامت کا مظاہرہ کرے یا شانِ اعجاز دکھا کر ایسے بیمار کو جس کا علاج مشکل اور ناممکن ہو قدرتِ الٰہی کے ذریعے شفا بخشے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآنِ حکیم میں "شفا" کو خدا سے نسبت دی گئی ہے

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ (سورۂ شعراء آیت ۸۰)

یعنی جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفا بخشتا ہے۔

لیکن دوسری آیات میں شفاء کو شہد اور قرآن سے بھی نسبت دی گئی ہے اور کہا گیا ہے:

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔

(سورۂ نحل۔ آیت ۔ ۶۹)

ترجمہ:

اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لئے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۲)

ترجمہ: ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لئے تو شفا اور رحمت ہے۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔

(سورہ یونس آیت ۔ ۵۷)

ترجمہ:

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے۔

ان دو قسم کی آیات (شفا دینا خدا کا کام ہے اور شہد و قرآن اس کی دلیل) میں مشترکہ چیز یہ ہے کہ خدا موثر بالاستقلال ہے اور تاثیر بخشنا اسی کا کام ہے لیکن دوسری چیزوں کی تاثیر اس کے حکم اور نسبت سے ہے۔

دنیا اور انسانی زندگی کے بارے میں بنیادی اسلامی نظریات اور فلسفہ میں تمام موثر چیزوں کو خدا سے نسبت دی جاتی ہے اور ان چیزوں کی وجوہات معمولی سی آزادی بھی نہیں رکھتیں اس لئے عقل و قرآن کی روشنی میں اس بات کے ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہی خدا جس نے شہد کو شفا بخشنے کی طاقت دی ہے اور جڑی بوٹیوں یا کیمیکل دواؤں کو صحت عطا کرنے کی

خوبی سے نوازا ہے۔ اسی خوبی اور طاقت کو پیامبروں اور اماموں کو عطا کر دے مثال کے طور پر سادھو ریاضت کے ذریعے زبردست روحانی طاقت حاصل کر سکتے ہیں اب اس بات کو سمجھنے میں کیا مشکل ہے کہ خداوند عالم تفضیل با عبودیت و بندگی کے نتیجہ میں انبیائے کرام اور اماموں کو وہ طاقت عطا کرے کہ وہ خاص شرائط کے تحت "محیر العقل" کام انجام دیں اور بغیر کسی فطری وجہ کے ان کاموں کو کر دکھائیں (اس سلسلے میں مصنف کتاب ہذا کی تصنیف "نیروی معنوی پیامبران" کا مطالعہ کیجیے) جس میں قرآنی آیات کے ذریعے انبیائے خدا کی روحانی طاقت کو ثابت کیا گیا ہے انبیائے کرام اور اماموں کا شفا بخشنا یا اولیائے خدا میں غیر معمولی کام انجام دینے کی قدرت کا وجود ایسے امر نہیں ہیں جن میں تناقض پایا جاتا ہو اس لئے کہ حقیقی معنی میں تو شفا و عطا کرنے والا خدا ہی ہے جس نے ان ذوات مقدسہ کو بھی یہ طاقت عطا کی ہے کہ وہ اس کے حکم کے مطابق دنیاوی مصلحتوں یا حقے سکیں۔

قرآنی آیات میں واضح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ لوگ انبیائے خدا اور شایمان کے علاوہ دیگر لوگوں سے بھی اس قسم کے کاموں کی انجام دہی کے لئے درخواست کیا کرتے تھے۔

ذیل میں جو قرآنی آیہ کریمہ پیش کی جا رہی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی حضرت موسیٰ سے پانی حاصل کرنے کی درخواست کی وہ بھی اس طرح کہ پانی انہیں قدرتی ذریعے سے نہیں بلکہ معجزانہ انداز سے فراہم کیا جائے اس آیۂ کریمہ میں قابل توجہ یہ امر ہے کہ بنی اسرائیل نے محض یہ نہیں کہا کہ اے موسیٰ ہمارے لئے دعا کیجیے تاکہ ہم پانی حاصل کر سکیں بلکہ ان کی طرف سے کہا گیا کہ ہمیں سیراب کریں اور ہمیں پانی دیں۔ آیت یہ ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ۔

(سورۂ اعراف ۔ آیت ۱۶۰)

ترجمہ:

اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔

اس سے بھی زیادہ واضح آیت وہ ہے جس میں حضرت سلیمان نے ان کو جو مجلس میں موجود تھے۔ حکم دیا کہ ہزاروں میل کا فاصلہ اور رکاوٹیں ہونے کے باوجود بھی تخت بلقیس کو حاضر کرو۔

أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ۔ (سورہ نمل۔ آیت ۳۸)

ترجمہ:

تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں!

بلقیس کا تخت غیر معمولی طور پر لایا گیا تھا۔ جیسا کہ سورہ نمل کی آیات ۳۹ اور ۴۰ میں "عفریت" اور "آصف برخیا" کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔

پوری بحث میں اہم نکتہ یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آسان اور معمولی کام کوئی بھی کرسکتا ہے لیکن غیر معمولی کام جو کہ انسان کی طاقت سے باہر ہیں خدا ہی انجام دے سکتا ہے۔

جب کہ خدائی اور غیر خدائی کاموں کا معیار استقلال اور عدم استقلال سے معلوم ہوتا ہے خدائی کام یہ ہے کہ فاعل اپنے علاوہ بغیر کسی دوسرے کی ضرورت نہ رکھتا ہو لیکن غیر خدائی کام جن میں آسان اور معمولی کام بھی شامل ہیں وہ ہیں جن کے انجام دینے میں فاعل مستقل نہ ہو بلکہ کسی دوسرے فاعل یا کسی مستقل طاقت کے سائے میں انجام ہوں۔

اس لئے اس بات میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ خداوند عالم اپنے اولیا کو ایسی طاقت مرحمت فرمائے جو غیر معمولی ہونے کے علاوہ عام انسان کی قدرت سے بھی ماورا ہو۔

قرآن میں واضح طور پر پوری صفائی سے حضرت عیسیٰ سے کہا گیا ہے:

وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۱۰)

تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا (زندہ کرتا) تھا

یہ تمام آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اولیا اللہ اس قسم کی طاقت رکھتے تھے اور ان سے غیر معمولی کاموں کو انجام دینے کی درخواست بھی ایک رائج بات تھی اور قرآن حکیم بھی ان باتوں کے صحیح ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں زندہ فرد سے سوال کرنے کے معاملے کو قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کیونکہ اس امر کی بھی نشاندہی ہو چکی ہے کہ ان تینوں صورتوں میں زندہ فرد سے سوال کرنا قرآنی آیات کے مطابق قطعی صحیح اور جائز امر ہے لہٰذا اب ہم ان باقی دو صورتوں کے بارے میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کریں گے جو پاک ارواح سے سوال کرنے سے متعلق ہیں۔

باب ۱۰

اولیائے خدا کی ارواح سے طلب مدد،

اہم مسائل میں سے ایک اور اہم مسئلہ ان اولیائے خدا سے مدد چاہنا ہے جو اس دنیا سے کوچ کر چکے ہوں۔ قطع نظر اس امر کے کہ یہ مدد دعا کی شکل میں ہو یا اس درخواست کے تحت ہو کہ اولیائے خدا دعا کرنے والے کے حق میں اللہ سے اس کی دعا کی قبولیت کیلئے سفارش کریں یہ مسئلہ اس وجہ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ آج جبکہ جناب رسول اکرم (ص) اور ائمہ طاہرین ؑ اس ظاہری دنیا میں موجود نہیں ہیں پھر بھی مسلمان ان کے توسل سے دعائیں مانگتے ہیں۔

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ عصر حاضر میں دعا کرنے والے مسلمان جناب رسول خدا (ص) یا اماموں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے کسی مسئلے کے بارے میں درخواست نہیں

کرتے بلکہ ان کی درخواستیں اور سوال انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ارواح مقدسہ سے متعلق ہوتے ہیں لہٰذا اس مسئلے کے بارے میں شرعی حکم کی مکمل وضاحت دیگر مسائل کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

مذکورہ بالا موضوع کی حقیقت بیان کرنے کے لیے درج ذیل چار نکات کی تشریح بیحد ضروری ہے اس لیے کہ ان نکات کو سمجھنے کے بعد ہی مذکورہ مسئلے کے بارے میں جو حکم شرعی ہے اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی موت کے بعد اس کی روح کا زندہ رہنا۔

۲۔ انسان کی حقیقت اس کی روح ہی ہے۔

۳۔ جہان ارواح سے رابطہ امکان پذیر ہے۔

۴۔ وہ صحیح احادیث جن کو محدثین اسلامی نے بیان کیا ہے نہ صرف اس قسم کی امداد طلبی کی درستی اور صحت کے بارے میں جیتا جاگتا ثبوت ہیں بلکہ اس امر کا ثبوت بھی ہیں کہ اولیائے خدا اور انبیائے برحق کی ارواح سے توسل مسلمانوں کی مستقل روش رہی ہے۔

موت انسان کی فنا کا باعث نہیں

قرآن کی آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے انسان اس راہ سے گزرنے کے بعد بالکل ایک نئی زندگی اور ایک نئے عالم میں داخل ہوتا ہے ایسے عالم میں جو اس جہان مادی اور فانی سے کہیں بالاتر ہے۔

بعض لوگ جو موت کو انسان کی فنا سمجھتے ہیں اور معتقد ہیں کہ موت کے ساتھ ہی انسان کا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد سوائے اس ایک جسم کے کچھ باقی نہیں رہتا جو کہ چند روز میں ہی خاک اور دوسرے عناصر میں تبدیل ہو جاتا ہے، غیر شعوری طور پر مادی فلسفہ کی پیروی کرتے ہیں اور مادی فلسفہ سے الہام حاصل کرتے ہیں

یہ طرزِ فکر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان نظریات کو رکھنے والا زندگی اور موت کو بدن کے آثارِ مادی، دماغ اور نروس سسٹم میں فزیکل اور کیمیاوی ردِ عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا جس میں بدن کی حرارت کم ہونے اور سیلول کے بے حس ہوجانے سے انسان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور انسان منجمد ہوجاتا ہے۔ اس مکتبِ فکر میں روح و آتما سوائے مادہ کے ردِ عمل اور اس کے خواص کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ان خواص میں خرابی اور بدن کے مختلف حصوں کے مابین متقابل تاثرات کے ختم ہوجانے کی وجہ سے روح اور آتما پورے طور پر معطل ہوجاتی ہے اور اس کے بعد روح اور اس کی بقاء وغیرہ کا کوئی وجود نہیں رہتا۔

روح کے بارے میں اس قسم کے نظریات مادی اصول سے پیدا ہوتے ہیں اس مکتبِ فکر میں انسان صرف ایک مشین ہے جو کہ مختلف کل پرزوں کے ایک دوسرے سے جڑنے کے بعد وجود میں آتی ہے اس کے مختلف اجزاء کی متقابل تاثیرات کی وجہ سے انسان کے دماغ میں فکر و فہم کی طاقت آتی ہے یا اس کے اجزاء کے منتشر ہوجانے کی وجہ سے فکر و حیات کے آثار ختم ہوجاتے ہیں۔

روح کے بارے میں مادہ پرستوں کے نظریات کو خدائی فلسفہ پر یقین رکھنے والے فلاسفر قبول نہیں کرتے اور انسان کے لیے بدن کے مادی نظام، نروس سسٹم اور ان کے متقابل ردِ عمل کے علاوہ اصل جوہر یعنی روح کے بھی قائل ہیں۔ جو کہ کچھ عرصے کے لیے انسانی بدن میں ہے اس کے بعد بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنے خاص ماحول میں ایک دوسرے لباس میں آجاتی ہے موت کے بعد روحوں کے زندہ رہنے کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کو اس کتاب میں ثابت کیا جائے کیونکہ آج انسان کی روح کا زندہ رہنے کا مسئلہ قرآنی آیات، فلسفیانہ دلائل اور علماء کے قابلِ یقین تجربوں سے ثابت ہوچکا ہے لہٰذا یہاں پر صرف ان قرآنی آیات کو بیان کیا جائے گا جن سے موت کے بعد روح کے زندہ رہنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

قرآنی آیات کا مطالعہ کرنے سے جہاں ارواح کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے وہاں ایسی

آیات بھی موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روح جسمِ انسانی سے جدا ہونے کے بعد زندہ رہتی ہے چنانچہ ہم ذیل میں ایسی چند آیات ہی کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ (سورۃ بقرہ آیت ۱۵۴)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ (سورۃ آلِ عمران آیت ۱۶۹)

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ

جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے۔ (سورۃ آلِ عمران آیت ۱۷۰)

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ .... (سورۃ آلِ عمران ۱۷۱)

وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں اور فرحاں ہیں....

إِنِّي آمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ

میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو (آخرکار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہوجا جنت میں" اس نے کہا "کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرمائی ہے اور مجھے قابلِ احترام لوگوں میں داخل فرمایا ہے (سورۃ یٰسین آیت ۲۵ تا ۲۷)

وہ بہشت جس میں اس سے داخل ہونے کو کہا گیا ہے بہشت برزخ ہے نہ کہ اخروی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس کی آرزو یہ ہے کہ اے کاش میری قوم مجھے پہچانتی کہ میرے خدا نے مجھے بخش دیا ہے اور مجھے عزت عطا فرمائی ہے لیکن جہان آخرت کے بارے میں اس قسم کی آگاہی کی آرزو ساز گار نہیں ہے کیونکہ وہاں انسان کی آنکھوں کے سامنے سے حجاب اور پردے اٹھا لیے جاتے ہیں اور دوسرے انسانوں کی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں رہتی لیکن اس دنیا میں اس آگاہی کے مقابلے میں "ناآگاہی" موجود ہے اس دنیا کے لوگ اس دنیا والوں کے بارے میں کوئی آگاہی نہیں رکھتے اور قرآنی آیات سے اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کے بعد کی آیات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مرنے اور بخشش دیئے جانے اور سرشار ہونے میں داخلے کے بعد اس کی قوم کے چراغ کو ایک آسمانی دھماکے سے بجھا دیا گیا:

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَامِدُونَ

ترجمہ: اس کے بعد اس قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی بس ایک دھماکہ ہوا اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے۔ (سورۃ یٰسین۔ آیت ۲۸-۲۹)

مندرجہ بالا آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اس کے بہشت میں داخلے کے بعد اس کی قوم جو اس دنیا میں تھی اچانک موت کا شکار ہو جاتی ہے اور ان ہی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہشت سوائے بہشت برزخ کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ

ترجمہ: دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جب

قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں مبتلا کرو۔

ان آیات کریمہ کے مفہوم کو مدنظر رکھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی زندگی قیامت سے قبل برزخ سے متعلق ہے اس لیے کہ قیامت کے آنے سے قبل انہیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے مگر جب قیامت آئے گی تو قیامت کے بعد انہیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر آیت میں يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ نہ کہا گیا ہوتا تو شاید آیت کا مفہوم قدرے واضح نہ ہوتا لیکن ان الفاظ کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت سے قبل کا زمانہ جب انہیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ صرف اور صرف برزخ کا زمانہ ہے۔

علاوہ ازیں "صبح و شام" کی بات بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا تعلق روز قیامت سے نہیں ہے اس لیے کہ قیامت کے دن صبح و شام نہیں ہے۔

انسان کی حقیقت روح ہے

انسان اپنی ترکیب کے لحاظ سے جسم و روح سے مرکب ہے لیکن انسان کی حقیقت اس کی اس روح میں ہے جو کہ اس کے بدن میں وجود رکھتی ہے۔

ہم اس مسئلے پر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے بحث نہیں کریں گے۔ یہاں یونانی اور اسلامی فلاسفروں کے دلائل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف قرآنی زاویہ نگاہ سے اس مسئلے کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ان آیات کے مطالعے سے جو انسان کے بارے میں قرآن میں آئی ہیں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی حقیقت اس کی نفس و روح ہی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے:

قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ۔ (سورۃ سجدہ۔ آیت ۱۱)

ترجمہ: (اے رسولؐ) کہہ دو! موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو

پورا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور تم پھر اپنے رب کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

لفظ "توفی" کے معنی "لے جانے" کے نہیں بلکہ "پکڑنے" کے ہیں۔

(مرحوم "علامہ بلاغی" نے اپنی کتاب تفسیر آلاء الرحمان (ص ۳۴) کے مقدمے میں لفظ توفی پر قابل قدر وضاحت بیان فرمائی ہے)۔

اس لیے "یتوفاکم" والے جملے کے یہ معنی ہیں "تم کو پکڑے گا"۔

بہرحال اس مختصر وضاحت سے یہ بات بالکل واضح ہے جب کبھی بھی انسان کی حقیقت اس کی روح کو سمجھا جائے گا آیت کی تعبیر صحیح ہوگی لیکن اگر روح انسان کی شخصیت کا ایک حصہ بن جائے اور انسان کا آدھا حصہ اس کا اس سے جدا ہو تو اس صورت میں یہ تعبیر صحیح نہیں ہوگی کیونکہ کبھی بھی فرشتۂ اجل ہمارے بدن اور اس کے ظاہری حصے کو نہیں پکڑتا بلکہ جسم اپنی حالت میں باقی رہتا ہے اور صرف ہماری روح کھینچ لی جاتی ہے۔

اگرچہ وہ آیات جو انسان اور اس کی روح کے مسئلے کو واضح کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں لیکن یہاں پر صرف مثال کے طور پر صرف یہی آیت بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو کہ "انسان اور اس کے روحی و معنوی کمالات کی حقیقت روح ہے اور بدن ایسا لباس ہے جو اس کو پہنایا گیا ہے اس سے پہلے بیان شدہ مطالب (موت کے بعد بھی انسان کی روح زندہ رہتی ہے) میں پورے طور پر واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن موت کو انسان کی فنا اور انسانی زندگی کا خاتمہ تصور نہیں کرتا بلکہ قرآن تو شہیدوں اور نیکوکار افراد کے علاوہ گنہگار انسانوں کیلئے بھی قیامت آنے سے پہلے زندگی کا معتقد ہے ایسی زندگی کا جس میں خوشی بھی، خوشخبری بھی اور عذاب بھی ہے۔

جب بھی انسان کی حقیقت اس کے بدن کو سمجھا جائے گا جو کہ بلاشک چند دنوں کے بعد خراب ہو کر مختلف عناصر میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں انسان کی بقا یا حیات برزخی قابل فہم نہیں ہوگی۔

○

قرآن میں دوسری دُنیا سے ربط و تعلق کا ثبوت

مادے سے جدا ہو کر روح کے زندہ رہنے کے ثبوت صرف دعویٰ ہی کے طور پر کافی نہیں ہیں، بلکہ ان کے زندہ رہنے کے علاوہ ان کے رابطے کے امکانات کو بھی علمی اور قرآنی اعتبار سے ثابت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب کے مصنف کی تصانیف میں سے "اصالتِ روح" نامی کتاب میں اسی مسئلہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

یہاں مختصراً یہ بتانے کے لیے کہ انسان اور گذشتگان کے درمیان رابطہ ہے کچھ قرآنی آیات کو پیش کیا جاتا ہے۔

- فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ۔
- فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ۔
- فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ۔

(سورۃ اعراف۔ آیت ۷۷، ۷۸، ۷۹)

○ پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اس طرح وہ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے؟

○ آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

○ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا آیات کا غور سے مطالعہ کریں تو مندرجہ ذیل حقائق کا پتہ چلتا ہے

پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ قوم زندہ تھی تو وہ حضرت صالحؑ سے عذابِ الٰہی کی درخواست کرتی تھی۔ دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ عذاب الٰہی نازل ہو گیا اور ان سب کو نابود کر دیا۔

تیسری آیت میں ہے کہ حضرت صالحؑ نے ان کی موت اور نابودی کے بعد ان سے کہا:

يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۷۹)

ترجمہ: میں نے خدا کے پیغام کو پہنچا دیا تھا لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے

اس بات کی دو وجوہات ہیں کہ وہ ان کی بربادی کے بعد ان سے بات کرتے ہیں:

۱۔ آیات کی نظم و ترتیب۔

۲۔ لفظ "فتولیٰ" میں "فا" کا حرف جو کہ ترتیب کو بیان کرتا ہے یعنی ان کی نابودی کے بعد ان سے منہ پھیر لیا اور یوں کہا:

"ولٰکن لا تحبون الناصحین" والے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قدر گہری دشمنی رکھتے تھے اور مرنے کے بعد بھی ایسی خباثت رکھتے تھے کہ نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

قرآن میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ (حضرت صالحؑ) اپنی قوم کی ارواح سے پوری سنجیدگی سے بات کرتے اور ان کو اپنا مخاطب قرار دیتے تھے اس کے بعد قرآن حکیم اس قوم کی مسلسل دشمنی سے آگاہ کرتا ہے جو کہ اس کی تباہی کے بعد بھی جاری رہی وہ کہتا ہے کہ اب بھی وہ قوم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتی۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ

(اعراف - ۹۱)

ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔

الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ۔ (اعراف - ۹۲)

جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخرکار برباد ہو کر رہے۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ۔ (اعراف - ۹۳)

اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گئے کہ اے برادران قوم، میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے۔

ان آیات میں بھی استدلال کا وہی طریقہ اپنایا گیا ہے جو کہ صالحؑ سے متعلق آیات میں ہے۔

رسولِ خدا (ص)، ارواحِ انبیاء سے کلام کر سکتے ہیں۔

وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رُّسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِن دُونِ الرَّحْمَٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ۔ (سورۂ زخرف آیت ۴۵)

ترجمہ: تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے۔

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ رسولِ خداؐ اسی فطری و قدرتی جہان سے اس دنیا میں آنے والے پیغمبروں سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تمام زمانوں میں تمام انبیاء کو خدا کا حکم یہی رہا ہے کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

قرآن میں انبیاء پر سلام بھیجا گیا ہے

قرآن مجید میں مختلف معاملوں میں انبیاء پر سلام بھیجا گیا ہے جو کہ کسی بھی صورت میں

سلام محض خشک، بے معنی تکلفات اور رسمی چیزیں نہیں ہو سکتے۔

یہ انصاف نہیں ہوگا اگر یہ کوشش کریں کہ قرآن مجید کے اعلیٰ معنی کو اس طرح بیان کریں کہ ان کی قدر و قیمت ختم ہو جائے۔ ٹھیک ہے کہ آج دنیا بھر کے مادہ پرست روح کی حقیقت کے قائل نہیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں مکتب مادہ پرستی کے لیڈروں اور انہیں وجود میں لانے والوں کے لیے سلام بھیجتے ہیں لیکن کیا یہ درست ہے کہ قرآن کے ان اعلیٰ مطالب کو جن میں حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اس طرح بیان کریں اور کہیں کہ یہ تمام سلام وغیرہ جو قرآن میں انبیاء پر بھیجے ہیں اور جن کو مسلمان دن رات ان کی شان میں پڑھتے ہیں سوائے خشک اور بے معنی تکلفات کے کچھ بھی نہیں ہیں

حالانکہ قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ :

۱۔ سَلَامٌ عَلٰی نُوحٍ فِی الْعَالَمِیْنَ

۲۔ سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ

۳۔ سَلَامٌ عَلٰی مُوسٰی وَهَارُوْنَ

۴۔ سَلَامٌ عَلٰی اِلْیَاسِیْنَ

۵۔ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ (دیکھئے سورۂ صافات : آیات ۷۹، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۸۱)

حالت تشہد میں پیغمبرؐ پر سلام

دنیا بھر کے مسلمان ان اختلافات کے باوجود جو کہ ان کی فقہوں میں ہے ہر روز نماز پڑھتے ہوئے حالت تشہد میں خداوند تعالیٰ کے عظیم القدر رسول (ص) کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تشہد کی حالت میں سلام بھیجنے کے عمل کو ہم نے اس لیے بطورِ دلیل پیش کیا ہے کیونکہ اس کے اثبات میں نہ صرف یہ کہ متعدد آیاتِ قرآنی موجود ہیں بلکہ امتِ مسلمہ کے مختلف فرقوں کے نزدیک ان کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے اس کی صحت کی

دلیل بھی موجود ہے یعنی سب فرقوں کی کتب میں اس اسلام کا ذکر موجود ہے۔

(دیکھیے "تذکرہ الفقہا" ج ۱ اور "کتاب خلاف" ج ۱ ص ۷۳)

کتاب خلاف میں کہا گیا ہے کہ اہل سنت کی فقہ کے رہبران جیسے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی ہیں ان سب نے مذکورہ تشہد کو قبول کیا ہے اور اسکے جواز کے بارے میں فتاوی بھی صادر کیے ہیں)

قطع نظر اس امر کے کہ شافعی اور دوسرے گروہ حالتِ تشہد میں مذکورہ سلام کا پڑھنا واجب سمجھتے ہیں جبکہ کچھ گروہ اس کا پڑھنا مستحب خیال کرتے ہیں تاہم یہ مسلّم امر ہے کہ تمام مسلمان فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سلام آنحضورؐ (ص) کی حیاتِ طیبہ میں بھی پڑھا جاتا رہا ہے اور آنحضورؐ کے وصالِ ظاہری کے بعد بھی اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ حقیقت ہے کہ جنابِ رسول اکرم (ص) سے مسلمانوں کا ربط اور تعلق ٹوٹ چکا ہے تو پھر یہ سلام اور وہ بھی خطاب کی حالت میں آخر کس لیے ہے!

بحث کا نتیجہ

سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ اور انسان کی فنا نہیں ہے بلکہ دوسری دنیا میں انسان کے جانے کا راستہ ہے پھر اس کے بعد دوسرے مرحلے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کی روح ہے اور بدن وہ لباس ہے جو اسے پہنایا گیا ہے اور اس کی روح باقی ہے تو لازمی طور پر اس کی حقیقت، شخصیت اور تمام طاقت بھی (بجز اس طاقت کے جو اس کے مادی بدن کا نتیجہ ہے) باقی رہتی ہے اس لیے اگر اس دنیا میں اس کا نفس دعا کرنے کی طاقت رکھتا ہے یا خدا کے حکم سے غیر معمولی کام انجام دے سکتا ہے تو اس دنیا میں بھی اس کا پاک نفس اس خدا کے حکم سے جو علیٰ کلِّ شیئٍ قدیر ہے سوائے ان کاموں کے جن کو انجام دینے میں مادی بدن کی ضرورت ہوتی ہے دوسرے تمام کاموں کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

تیسرے مرحلے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان اس دُنیا کے لوگوں سے رابطہ رکھ سکتا ہے اور پاک روحیں ہماری باتوں کو سنتی ہیں۔

ان تینوں دلائل کے بعد منطقی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ اولیاء اللہ ہماری دعاؤں کو سن سکتے ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کا جواب بھی دے سکتے ہیں لیکن اسلامی نظریے کے مطابق اس قسم کا کام شرع کے مطابق ہو گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ذیل میں چوتھے مرحلے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

ارواحِ مقدسہ سے حاجت روائی کی درخواست

ابن تیمیہ اور اس کے ماننے والے خاص قسم کے منصوبے کی بنا پر اس بات کے منکر ہیں کہ اصحابِ رسول (ص) اور ان کے بعد مسلمانوں نے نہ صرف جناب رسولِ اکرم (ص) بلکہ دوسرے بزرگانِ دین سے کسی حاجت روائی کے لیے درخواست کی تھی ان لوگوں کا کہنا ہے کہ:

لَمْ يَكُنْ اَحَدٌ مِنْ سَلَفِ الْاُمَّةِ فِيْ عَصْرِ الصَّحَابَةِ وَلَا التَّابِعِيْنَ وَلَا تَابِعِيْ التَّابِعِيْنَ يَتَخَيَّرُوْنَ الصَّلَاةَ وَالدُّعَاءَ عِنْدَ قُبُوْرِ الْاَنْبِيَاءِ وَيَسْاَلُوْنَهُمْ وَلَا يَسْتَغِيْثُوْنَ بِهِمْ لَا فِيْ مَغِيْبِهِمْ وَلَا عِنْدَ قُبُوْرِهِمْ۔

(رسالۃ الهدیة السنیة ۱۶۲۔ طبع منار مصر)

ترجمہ: بزرگانِ امت سے جو گزر گئے ہیں کوئی بھی صحابہؓ کے دور میں یا تابعین یا تبع تابعین کے دور میں نماز پڑھنے یا دعا کرنے کیلئے انبیاءؑ کی قبروں کی نزدیکی جگہ کو انتخاب نہیں کرتا تھا اور کسی بھی صورت میں ان سے نہ تو کوئی سوال کرتا تھا نہ ہی انہیں پکارا کرتا تھا نہ ان کی غیر موجودگی کی صورت میں اور نہ ان کی قبروں کے نزدیک۔

شاید وہ شخص جو صحابہ اور تابعین کی تاریخ سے بے خبر ہے یہ تصور کرے کہ اس قول کی

کوئی حقیقت ہو سکتی ہے لیکن اگر معتبر تاریخی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت امر اس قول کے بالکل برعکس ہے چنانچہ ہم ذیل میں اس قول کے غلط ہونے کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

اَصَابَ النَّاسُ قَحْطٌ فِيْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَجَاءَ رَجُلٌ اِلٰى قَبْرِ النَّبِيِّ (ص) فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِسْتَسْقِ اللّٰهَ لِاُمَّتِكَ فَاِنَّهُمْ قَدْ هَلَكُوْا فَاَتَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) فِي الْمَنَامِ فَقَالَ: اِئْتِ عُمَرَ فَاَقْرِئْهُ السَّلَامَ وَاَخْبِرْهُ اِنَّهُمْ مُسْقَوْنَ۔

(دیکھیے کتاب وفاء الوفاء ج ۔ ص ۱۳۶۱)

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قحط پڑا ایک شخص حضورؐ کی قبر کی جانب آیا اور کہا یا رسولؐ اللہ اپنی امت کے لیے پانی مانگیے وہ نابود ہو رہی ہے اس کے بعد حضورؐ اس کے خواب میں آئے اور فرمایا عمرؓ کے پاس جا اور میرا اسلام پہنچا اور اس کو اطلاع دے کہ سب کے سب پانی سے سیراب ہو جائیں گے۔

اس واقعہ کو تحریر کرنے کے بعد سمہودی لکھتا ہے کہ:۔

وَمَحَلُّ الْاِسْتِشْهَادِ طَلَبُ الْاِسْتِسْقَاءِ مِنْهُ (ص) وَهُوَ فِي الْبَرْزَخِ وَدُعَاءُهُ لِرَبِّهِ فِيْ هٰذِهِ الْحَالَةِ غَيْرُ مُمْتَنِعٍ وَعِلْمِهِ بِسُؤَالِ مَنْ يَسْاَلُهُ قَدْ وَرَدَ فَلَا مَانِعَ مِنْ سُؤَالِ الْاِسْتِسْقَاءِ وَغَيْرِهِ مِنْهُ كَمَا كَانَ فِي الدُّنْيَا۔

(دیکھیے وفاء الوفاء ج ۔۲۔ ص ۱۳۶۱)

ترجمہ: یہ واقعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ حالانکہ حضورؐ عالم برزخ میں ہیں لیکن ان سے دعا کی درخواست کی جا سکتی ہے اور اس بات میں کوئی برائی نہیں ہے کیونکہ ان سے درخواست آگاہ افراد سے درخواست کا حکم رکھتی ہے اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ آپ سے اسی طرح درخواست کی جائے جیسے کہ آپ زندہ ہوں۔

۲۔ "سمہودی" نے حافظ ابو عبد اللہ محمد بن موسیٰ بن النعمان اور اس سند کے حوالے

سے جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے متعلق ہے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ابھی آنحضورؐ کو دفن کیے ہوئے صرف تین دن گزرے تھے کہ ایک عرب جو مدینے کا نہیں تھا باہر سے آیا تھا اس نے خود کو قبرِ رسول (ص) پر گرانے کے بعد جناب رسول اکرم (ص) کو مخاطب کرکے کہا:-

يَا رَسُوْلَ اللهِ، قُلْتَ فَسَمِعْنَا قَوْلَكَ وَ وَعَيْتَ عَنِ اللهِ سُبْحَانَهُ مَا وَعَيْنَا عَنْكَ وَكَانَ فِيْمَا اُنْزِلَ عَلَيْكَ (وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ.....) وَقَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ جِئْتُكَ تَسْتَغْفِرُ لِيْ.....

(وفاء الوفاء - جلد - ۲ - ص ۱۳۶۱)

ترجمہ: یا رسول اللہ! جو کچھ آپؐ نے فرمایا ہم نے سنا، جو کچھ آپؐ نے خداؐ سے حاصل کیا وہ سب کچھ ہم نے آپؐ سے حاصل کیا، جو کچھ آپؐ کے بارے میں نازل ہوا ان میں سے یہ آیت بھی ہے کہ (جب کبھی وہ اپنے نفوس پر ظلم کریں اگر وہ تیرے پاس آئیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں نیز تو بھی ان کے حق میں استغفار کرے تو بے شک وہ خدا کو بڑا بخشنے والا اور مہربان پائیں گے) چنانچہ اب جبکہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے میں آپؐ کے حضور حاضر ہوا ہوں (اس التجا کے ساتھ کہ) آپؐ میری مغفرت کیلئے دعا فرمائیں.....

"وفاء الوفاء فی الاخبار المصطفیٰ" کا مصنف آٹھویں باب کے آخر میں بے انتہا ایسے واقعات کو بیان کرتا ہے جن میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ سے حاجت کے پورا ہونے کی درخواست کرنا مسلمانوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ کہتا ہے کہ امام محمد بن موسیٰ بن نعمان نے اس موضوع سے متعلق "مصباح الظلام فی المستغیثین بخیر الانام" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے

۳. محمد بن المنکدر کہتا ہے:

ایک شخص نے اسّی دینار میرے والد کے پاس امانت کے طور پر رکھے اور خود جہاد کے لیے چلا گیا اور میرے والد سے کہا: "اگر ان پیسوں کی ضرورت پڑ جائے تو انہیں خرچ کر لینا۔ اتفاق سے مہنگائی بڑھ گئی اور میرے والد نے ان پیسوں کو خرچ کر لیا یہاں تک ان پیسوں کا مالک آ گیا اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ میرے والد نے اس سے کہا کہ وہ دوسرے دن آئے۔ رات کو میرے والد مسجد گئے، صبح کے قریب تک حضورؐ کی قبر اور آپؐ کے منبر کی جانب اشارہ کرکے اور حضورؐ سے رقم کے ادا ہو جانے کی درخواست کرتے رہے رات کے دھندلکے میں مسجد میں ایک شخص آیا اور کہا لے ابا محمد لو۔ اس نے میرے والد کو ایک تھیلی دی جس میں اسّی دینار تھے۔

(کتاب - وفاء الوفاء - ج - ۲ - ص ۱۳۸۰ طبع مصر)

۴: ابوبکر ابن المقری کہتا ہے:

طبرانی، ابوالشیخ اور میں جناب رسول خدا (ص) کی قبر مبارک کے پاس تھے کہ ہم سب پر بھوک کا غلبہ ہوا (یعنی ہمیں بھوک کا شدت سے احساس ہونے لگا) رات کی تاریکی میں ہم قبرِ رسول (ص) کے قریب گئے اور عرض کی "یا رسول اللہ الجوع" پھر ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ مسجد کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولنے پر ایک علوی شخص دو نوجوانوں کے ہمراہ مسجد میں داخل ہوا، دونوں جوانوں نے کھانا اٹھا رکھا تھا جب ہم سب کھانا کھا چکے تو اس علوی نے کہا:

میں نے جناب رسولِ اکرم (ص) کو خواب میں دیکھا اور انہوںؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں تم لوگوں کے لیے کھانا لے کر آؤں (دیکھیے کتاب وفاء الوفاء جلد ۲ - صفحہ ۱۳۸۲)

۵- ابن جلاد کہتا ہے:

میں انتہائی غربت اور زبوں حالی کے ساتھ مدینہ منورہ

کے قریب پہنچا اور میں نے عرض کی یارسول اللہ! میں آپ کا مہمان ہوں اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل گئی میں نے خواب میں جناب رسول اکرم (ص) کو دیکھا جو میرے ہاتھ میں ایک روٹی دے رہے تھے . . . . .

(دیکھیے وفاء الوفاء جلد ۲ - ص ۱۳۶۱)

یہاں ہم ان واقعات کی صحت کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ واقعات خواہ صحیح ہوں یا نہ ہوں اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس قسم کے عمل کا رواج رہا ہے اور اگر یہ اعمال بدعت، حرام، شرک یا کفر ہوتے تو کسی بھی صورت میں ان واقعات کو مسلمان مؤلفین اپنی کتابوں میں نہ تحریر کرتے۔

(ہم نے "اصالت روح" والے باب میں "ارواح کے رابطے" کے عنوان کے تحت ان روایات اور احادیث کو بیان کیا ہے جن میں پاک روحوں سے دعا کی درخواست کی درستی کو بیان کیا گیا ہے۔)

○

باب ۱۱

اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست کرنا

ہم سب "شفاعت" کی اصطلاح سے بخوبی واقف ہیں جب بھی کسی شخص سے سرزد شدہ جرم، گناہ یا اس کی سزا کی بات ہوتی ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کی وساطت کے لیے سامنے آتا ہے تاکہ وہ موت یا قید ہونے کی سزا سے بچ جائے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس سلسلے میں شفاعت کی ہے۔

شفاعت کا لفظ "شفع" سے نکلا ہے جس کے معنی جفت ہیں جو کہ "وتر" یعنی طاق کی ضد ہے۔ گناہ گار کی نجات کے لیے دوسرے شخص کی وساطت کو "شفاعت" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے کا مقام و عظمت اور اس کا اثر ان خوبیوں کے ساتھ جو شفاعت حاصل کرنے والے میں ہیں (خواہ وہ کسی قدر کم ہوں) جڑ (جفت) اور مل جاتی ہیں اور دونوں

چیزیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے گناہ گار کی آزادی کا سبب بن جاتی ہیں۔

اولیاء اللہ کی گناہ گار کے لیے شفاعت کی ظاہری حقیقت یہ ہے کہ خدا کے وہ نیک بندے جو خدا کے دربار میں نزدیکی اور مقام رکھتے ہیں (البتہ یہ دونوں چیزیں خدا کے حکم اور خاص ضوابط کے تحت ہیں جو کلی طور پر ہیں نہ فردی طور پر) مجرموں اور گناہ گاروں کے لیے وساطت کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ دعا کے ذریعے سے خداوند تعالیٰ سے یہ چاہیں کہ وہ ان کے قصور اور گناہ درگذر کرے لیکن شفاعت کرنے اور اس کے قبول ہوجانے کے لیے خاص شرائط ہیں جن میں کچھ گناہ گار سے اور کچھ خود "گناہ" سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں شفاعت، خدا کے حکم سے اولیاء اللہ کی وہ مدد ہے جو وہ ایسے انسانوں کیلئے کرتے ہیں جو باوجود اس کے کہ گناہ گار ہیں لیکن خدا اور اولیاء اللہ سے اپنا معنوی تعلق نہیں توڑتے کیونکہ اس تعلق کو ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہیے۔

شفاعت کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک پست وجود جو حرکت اور پیش رفت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ایک اعلیٰ وجود سے ایک فطری اصول کے مطابق مدد چاہے لیکن ضروری یہ ہے کہ مدد چاہنے والا روحی کمال کی حیثیت سے اس حد تک پست نہ ہو کہ حرکت و پیش رفت کرنے کی تمام طاقت کو کھو دے اور ایک پاک انسان میں تبدیل ہونے کے تمام امکانات اور احتمالات سے محروم ہوجائے۔

آنحضور ؐ کے زمانے سے لے کر بعد تک مسلمان شفاعت کی درخواست حقیقی شافعوں سے کرتے رہے ہیں اور ان کی زندگی یا موت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس قسم کی درخواست کو کسی بھی مسلمان دانشمند نے کسی بھی اسلامی اصول کے خلاف نہیں سمجھا یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں "ابن تیمیہ" پیدا ہوتا ہے اور ایک خاص طرز فکر سے مسلمانوں میں رائج بہت سی رسموں کی مخالفت کرنے لگا اور اس کے تین سو سال بعد دوبارہ "محمد بن عبدالوہاب نجدی" اٹھتا ہے اور ابن تیمیہ کے مکتب کو سخت طریقے سے نئی زندگی بخشتا ہے۔

دوسرے تمام اسلامی فرقوں سے وہابیوں کا ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے

مسلمانوں ہی کی طرح شفاعت کو اگرچہ ایک اسلامی اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیامت کے دن شافع حضرات امت کے گناہ گاروں کے بارے میں شفاعت کریں گے اور پیغمبر اکرم ؐ اس سلسلے میں اہم کردار رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں" کہ کسی بھی صورت میں ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس دنیا میں ان سے شفاعت کی درخواست کریں اور اس سلسلے میں وہابی اس حد تک متعصب ہیں کہ ان کے نظریات کو بیان کرنا بھی روحی رنج کا باعث ہے۔ مختصر یہ کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگرچہ رسول علیہ السلام اور دوسرے انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کا حق حاصل ہے لیکن شفاعت کو اس کے اصلی مالک اور اسی کے حکم سے یعنی اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا چاہتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ شَفِّعْ نَبِیَّنَا مُحَمَّدًا (ص) فِیْنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَوْ اَللّٰھُمَّ شَفِّعْ فِیْنَا عِبَادَكَ الصَّالِحِیْنَ اَوْ مَلَائِكَتَكَ اَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ مِمَّا یُطْلَبُ مِنَ اللّٰهِ لَا مِنْھُمْ فَلَا یُقَالُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْ یَا وَلِیَّ اللّٰهِ اَسْئَلُكَ الشَّفَاعَةَ اَوْ غَیْرَھَا مِمَّا لَا یَقْدِرُ عَلَیْهِ اِلَّا اللّٰهُ وَاِذَا طَلَبْتَ ذٰلِكَ فِیْ اَیَّامِ الْبَرْزَخِ كَانَ مِنْ اَقْسَامِ الشِّرْكِ۔

(الهدایة السنیة۔ رسالہ دوم۔ ص ۴۲)

ترجمہ: اے پروردگار قیامت کے دن انبیاء ؑ اور دوسرے نیک بندوں کو ہمارا شفیع بنا لیکن ہمیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ کہیں" اے خدا کے پیغمبر ؐ یا خدا کے ولی تجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہماری شفاعت کر کیونکہ شفاعت پر سوائے خدا کے اور کوئی قادر نہیں ہے اور جب بھی پیغمبر ؐ سے جو کہ عالم برزخ میں ہیں اس قسم کی دعا کریں گے تو شرک میں گرفتار ہوجائیں گے۔

وہابیوں نے شفاعت کے سلسلے میں بہت سی دعاؤں کو جو کہ حقیقی شافعوں سے کی جاتی ہیں حرام جبکہ درخواست کرنے والے کو مشرک اور اس عمل کو شرک بتاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کی دلیلوں کا جائزہ لیں، کتاب و سنت اور مسلمانوں کی عام

رسم و رواج کا جائزہ پیش کریں گے۔ پھر اس کے بعد وہابیوں کے دلائل کا جائزہ لیں گے۔

شفاعت کی درخواست اور ہمارے دلائل

درخواست شفاعت کے صحیح ہونے کے سلسلے میں ہمارے دلائل کے دو پہلو ہیں جن سے موضوع واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ شفاعت کی درخواست وہی دعا کی درخواست ہے۔

۲۔ مناسب و شائستہ افراد سے دعا کی درخواست مستحب ہے۔

چنانچہ ہم ذیل میں ان دونوں پہلوؤں کی تفصیل بیان کرتے ہیں:۔

شفاعت کی درخواست درحقیقت دعا کی درخواست ہے

جناب رسولِ خدا (ص) اور دوسرے شافع حضرات کی شفاعت بارگاہِ الٰہی میں دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ دعا اس لیے ہے کہ خداوندِ عزوجل کی بارگاہ میں شافع حضرات کو جو مقام و عظمت حاصل ہے، اس کی بنا پر جب یہ ذواتِ مقدسہ گنہگاروں کے حق میں دعا کرتے ہیں تو خداوندِ عزوجل ان ذواتِ مقدسہ کی دعا کی وجہ سے گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں پر لطف و کرم کرتے ہوئے ان کے گناہ بخش دیتا ہے اسی لیے برادرِ مومن سے بھی دعا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ صاحبِ ایمان مقربِ بارگاہِ الٰہی ہوتا ہے اور خدا اسکی دعا کو قبول کرتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک مومن بھائی دوسرے بھائی کے حق میں دعا کر سکتا ہے تو پھر قابلِ غور و فکر ہے یہ بات کہ آخر مسلمان کیونکر جناب رسولِ اکرم (ص)، یا دیگر ذواتِ مقدسہ سے دعا کی درخواست کو مستحسن عمل قرار نہیں دے سکتے! نیز آخر وہ کون سی وجہ ہے جسکی بنا پر مسلمان علما جن میں وہابی بھی شامل ہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

اگرچہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قیامت کے دن شفاعت کا مطلب بارگاہِ خداوندی میں مکمل طور پر دعا کہلائے گا تاہم پھر بھی ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ شفاعت کے مفہوم کی روشنی میں وہ ایک قسم کی دعا ہی ہے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ:

يَا وَجِيهًا عِنْدَ اللهِ اِشْفَعْ لَنَا عِنْدَ اللهِ۔

بارگاہِ خداوندی میں صاحب جاہ و مقام ہستی اللہ کے حضور ہماری شفاعت کر، درحقیقت وہ اپنے اس قول سے اسی حقیقت کا اقرار کرتے ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

نظام الدین نیشاپوری نے اس آیت کی تفسیر میں"

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا۔ (سورۃ نساء آیت ۸۵) میں واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ: اَلشَّفَاعَةُ اِلَى اللهِ اِنَّمَا هِيَ الدَّعْوَةُ لِمُسْلِمٍ۔ " مسلمانوں کے لیے شفاعت کی حقیقت التجا یعنی دعا کرنا ہے۔

حضورؐ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ جو بھی اپنے مسلمان بھائی کے لیے دعا کرے گا اس کی دعا قبول ہو جائے گی اور فرشتہ جواب میں کہتا ہے کہ ایسا ہی تیرے لیے بھی ہوگا۔ کیونکہ ابن تیمیہ ان لوگوں میں سے ہے جو زندہ سے دعا کی درخواست کو صحیح قرار دیتے ہیں اس لیے انبیاء اور اولیاء اللہ ہی سے شفاعت کی درخواست کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر مومن شخص سے جو درگاہِ خدا میں مقبول ہو یہ درخواست کی جا سکتی ہے۔

" فخرالدین رازی " کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے شفاعت کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہی مخصوص نہیں کیا بلکہ کہا ہے کہ ہر وہ مومن شخص جسے بارگاہِ خداوندی میں تقرب حاصل ہو اس سے شفاعت کی درخواست کی جا سکتی ہے نیز موصوف نے شفاعت کو بارگاہِ خداوندی میں دعا کی حیثیت سے تعبیر کیا ہے۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً۔

(سورۃ غافر۔ آیت ۷)

اور ایمان لانے والوں کے حق میں (عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے) دعائے مغفرت

کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے"

فخر رازی کا کہنا ہے کہ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ حاملان عرش فرشتوں کی شفاعت صرف گناہ گاروں کے بارے میں ہے۔

حضورؐ اور دوسرے انبیاءؑ کی شفاعت بھی اسی گروہ کے بارے میں ہے اسی لیے خداوندِ عالم یہ حکم دیتا ہے :

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ (سورۃ محمدؐ آیت ۱۹)

اپنے گناہوں اور باایمان لوگوں کی بخشش کے لیے دعا کرو۔ حضرت نوحؑ نے اپنے والدین اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور ان تمام باایمان لوگوں کے بارے میں جو قیامت تک آئیں گے بخشش کی دعا فرمائی اور اس طریقے سے اپنے فریضہ شفاعت کو پورا کیا۔

(دیکھیے سورۃ نوح - آیت ۲۸)

فخرالدین رازی کا یہ بیان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس نے شفاعت کو گناہ گار کے لیے شفیع کی دعا اور شفاعت کو دعا کی درخواست کے معنی میں لیا ہے۔

احادیث میں ایسے واضح اشارے موجود ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مسلمان کی دعا شفاعت ہے۔

"ابن عباس" حضورؐ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلًا لَا يُشْرِكُونَ بِاللَّهِ شَيْئًا إِلَّا شَفَّعَهُمُ اللَّهُ فِيهِ۔

(صحیح مسلم - ج - ۳ - ص ۵۴)

ترجمہ : جب بھی کوئی مسلمان انتقال کرے اور چالیس ایسے آدمی جو شرک نہیں کرتے اس کے جنازے پر نماز پڑھیں تو خداوندِ عالم اس کے بارے میں ان کی شفاعت (دعا) کو قبول فرمائے گا۔

اس حدیث میں دعا کرنے والے کو شافع قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے چالیس باوفا دوستوں سے یہ چاہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے جنازے کی نماز میں شریک ہوں اور اس کے لیے دعا کریں تو درحقیقت اس نے ان سے شفاعت کی درخواست ہی نہیں کی بلکہ خدا کے بندوں کی شفاعت کے لیے زمین بھی ہموار کی ہے۔

صحیح بخاری میں إِذَا اسْتَشْفَعُوا إِلَى الْإِمَامِ لِيَسْتَسْقِيَ لَهُمْ لَمْ يَرُدَّهُمْ ...... کے عنوان کے تحت ایک باب موجود ہے۔ اور اس باب میں واضح کیا گیا ہے کہ :

جب لوگوں نے اپنے امام سے شفاعت کی درخواست کی کہ ان کے لیے بارش کی دعا کریں تو ان کی درخواست کو رد نہیں کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ صحیح بخاری میں ہی اس کے علاوہ ایک دوسرا باب بھی ہے إِذَا اسْتَشْفَعَ الْمُشْرِكُونَ بِالْمُسْلِمِينَ عِنْدَ الْقَحْطِ کے عنوان کے تحت (جب کہ مشرکین قحط کے سلسلے میں شفاعت کی درخواست کرتے ہیں، مسلمانوں سے) جس میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں سے شفاعت طلب کی بہرحال ان دونوں بابوں کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شفاعت کی درخواست دراصل دعا ہے اور اس کو کسی دوسرے رنگ میں تفسیر نہیں کرنا چاہیے۔

یہاں تک ایک بات کو واضح کیا گیا ہے اور یہ کہ "شفاعت" کی حقیقت سوائے دعا کے اور کچھ نہیں اب ہم دوسری دلیل کو بیان کرتے ہیں یعنی کسی مومن بھائی اور اولیاء اللہ سے دعا کی درخواست ایک مستحب فعل ہے۔

قرآن اور حضورؐ سے دعا کی درخواست

قرآنی آیات ثابت کرتی ہیں کہ لوگوں کے لیے جناب رسولِ خداؐ کی دعا مکمل طور پر موثر اور مفید ہوتی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے پتہ چلتا ہے۔

۱۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ.... اپنے گناہوں اور باایمان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کی۔

٢۔ ۔۔۔۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ۔۔۔۔ ان کے لیے دعا کر، تیری دعا ان کے لیے سکون کا باعث ہے۔

جب انسان کے لیے حضورؐ کی دعا کے ایسے فائدے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے کہ حضورؐ سے انسان اپنے لیے اس قسم کی دعا کی درخواست کرے، جب کہ دعا کی درخواست شفاعت کی درخواست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

٣۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا۔

(سورۂ نساء - آیت ٦٤)

ترجمہ: (گزشتہ صفحات پر بیان کیا جا چکا ہے۔)

یہاں پر "جاءُوكَ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی تمہارے پاس آجاتے" مقصد یہ ہے کہ آئیں اور پیغمبرؐ سے دعاءِ بخشش کی درخواست کریں۔ اگر مقصد یہ نہ ہوتا تو ان کا آنا بے کار تھا جب کہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آنا اور درخواست کرنا خود ان میں باطنی اور روحی انقلاب کو ثابت کرتا ہے جو کہ دعا کے قبول ہونے کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔

٤۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوبؑ کے لڑکوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ ان کے لیے بخشش کی دعا کریں۔ حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی بات کو مان لیا اور اپنے وعدے پر عمل کیا۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي۔

انہوں نے کہا، "اباجان، ہمارے لیے بخشش کی دعا کریں ہم نے غلطی کی تھی۔" انہوں نے بھی کہا "جلد ہی تمہاری بخشش کی دعا کروں گا۔"

یہ تمام آیات بیان کرتی ہیں کہ انبیاء اور دوسرے صالح افراد سے دعا جو کہ حقیقت میں شفاعت ہی ہے اسلامی نقطۂ نظر میں بالکل قابلِ تنقید نہیں ہے۔

احادیث اور صحابہؓ کی سیرت

مشہور و معروف محدث "ترمذی" جس کا شمار صحاح اہل سنت میں سے ہوتا ہے انس کے حوالے سے کہتا ہے۔

سَأَلْتُ النَّبِيَّ (ص) أَنْ يَشْفَعَ لِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقَالَ أَنَا فَاعِلٌ قُلْتُ فَأَيْنَ أَطْلُبُكَ فَقَالَ عَلَى الصِّرَاطِ ۔۔۔۔۔

(کشف الارتیاب - ص ٢٦٣ منقول از سنن ترمذی)

ترجمہ: (انسؓ کہتا ہے) میں نے پیغمبرؐ سے درخواست کی کہ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں۔ آپ نے قبول کر لیا اور فرمایا "شفاعت کروں گا" میں نے کہا "آپ کہاں ملیں گے" فرمایا "صراط کے پاس"۔

انس پیغمبرؐ سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں اور آپ بھی قبول کر لیتے ہیں اور ان کو خوشخبری دیتے ہیں۔

"سواد قارب" جن کا شمار جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوستوں میں ہوتا ہے انہوں نے آنحضور (ص) سے اپنے اشعار میں یوں شفاعت کی درخواست کی ہے کہ

فَكُنْ لِي شَفِيعًا يَوْمَ لَا ذُو شَفَاعَةٍ

بِمُغْنٍ فَتِيلًا عَنْ سَوَادِ بْنِ قَارِبِ

(دیکھیے قاموس الرجال۔ "مادۂ سواد")

ترجمہ: اے پیغمبرؐ قیامت کے دن میرے شفیع بنیے اس دن جب کہ دوسروں کی شفاعت سواد قارب کے لیے فائدہ مند اور مفید نہیں ہوگی۔

"حمیر قبیلے کے "تبع" نامی ایک شخص نے پیغمبرؐ کی پیدائش سے پہلے سنا تھا کہ جلد ہی خدا کی جانب سے سرزمینِ حجاز میں ایک نبیؐ آئے گا چنانچہ اس نے مرنے سے پہلے ایک خط لکھا اور اپنے عزیزوں سے درخواست کی اگر کبھی ایسا پیغمبرؐ معبوث ہوا تو میرا خط اس کو دینا خط میں تحریر تھا۔

وَإِنْ لَمْ أُدْرِكْكَ فَاشْفَعْ لِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا تَنْسَنِي

اگر میری عمر نے وفا نہیں کی اور تیرے دیدار سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو آخرت میں میری شفاعت کرنا اور مجھ کو بھول نہ جانا۔

جب یہ خط پیغمبرؐ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے تین دفعہ کہا:

مَرْحَباً بِتُبَّعٍ الْاَخِ الصَّالِحِ مرحبا میرے نیک بھائی "تبع"

اگر شفاعت کی درخواست کرنا شرک ہوتا تو کسی بھی صورت میں پیغمبرؐ اس کو اپنا بھائی نہیں کہتے اور تین دفعہ مرحبا نہیں کہتے۔

مرنے کے بعد کسی سے شفاعت کی درخواست کرنا

ہم احادیث پر مبنی اس حصے میں یہ بیان کریں گے کہ حقیقی شفیع سے شفاعت کی درخواست کرنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے خواہ یہ درخواست شفیع کی زندگی میں ہو یا اس کے مرنے کے بعد! سب سے پہلے اس سلسلے میں ان احادیث کا ذکر کیا جائے گا جن میں کہا گیا ہے کہ پیغمبرؐ کے صحابہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی پاک روح سے شفاعت کی درخواست کیا کرتے تھے۔

۱۔ ابن عباس کہتے ہیں: جب حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ کو غسل دے دیا اور کفن پہنا چکے تو آپؐ کے چہرہ مبارک کو کھولا اور فرمایا:

بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ طِبْتَ حَیًّا وَطِبْتَ مَیِّتًا۔ وَاذْکُرْنَا عِنْدَ رَبِّکَ

(نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۲۳۰)

ترجمہ: میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں آپ اپنی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی پاک و پاکیزہ ہیں۔ اپنے پروردگار کے سامنے ہمارا ذکر بھی فرمایئے گا۔

۲۔ جب جناب رسول اکرمؐ کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے آنحضورؐ کے چہرۂ مبارک کا بوسہ لینے کے بعد کہا:۔

میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں آپ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں پاک و پاکیزہ ہیں۔ اپنے پروردگار کے سامنے (یا رسول اللہ) ہمارا ذکر بھی کیجیے گا اور ہمیں بھولیے

گا نہیں۔ (کشف الارتیاب۔ ص۔ ۲۶۵۔ نقل از خلاصۃ الکلام)

ان روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کی درخواست خواہ وہ شفیع کی زندگی میں ہو یا اس کی موت کے بعد اس میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ اگر ان آیات و روایات کے علاوہ جنہیں اوپر بیان کیا گیا ہے مسلمانوں کے مختلف ادوار میں رائج رسم و رواج کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو شفاعت کی درخواست کا مسئلہ اس انداز سے واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ پھر اس مسئلے کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر اس ضمن میں سب سے بڑی اور اہم بات جناب رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد آنحضورؐ کے صحابہ کی طرف سے جناب رسولِ خداؐ (ص) سے دعا کی درخواست کرنا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ اصحابِ رسول (ص) جنابِ رسالتمآب (ص) کی وفات کے بعد آنحضور (ص) سے اپنی مغفرت کے لیے دعا کرنے کی درخواست کرتے تھے تو شفاعت کی درخواست بھی بالکل جائز ہے اس لیے کہ درخواستِ شفاعت درحقیقت دعا کی درخواست ہی ہے۔

(اس ضمن میں مزید معلومات کے لیے زیرِ نظر کتاب کے مؤلف کی تصنیف "شفاعت در قلمروِ عقل و قرآن و حدیث" کا مطالعہ کیجیے جس میں مصنف نے متعلقہ موضوع کے ضمن میں اہل سنت کی کتب سے ۴۵ احادیث اور اہل تشیع کی کتب سے ۵۲ احادیث بیان کی ہیں)۔

باب ۱۲

طلبِ شفاعت کے ناجائز ہونے کے بارے میں وہابیوں کے دلائل

پچھلے باب میں درخواستِ شفاعت کے صحیح ہونے کے سلسلے میں دلائل بیان کیے گئے ہیں اور اب درخواستِ شفاعت کے مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں مخالفین نے کچھ دلائل بیان کیے ہیں جن کے تحت اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست کو حرام کہا گیا ہے یہاں پر مختصر طور پر ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

۱۔ شفاعت کی درخواست شرک ہے۔

یہاں شرک سے اس گروہ کا مقصد، عبادت میں شرک ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شفاعت کی درخواست شفیع کی پرستش ہے۔

اس سے قبل تفصیل سے عبادت کے موضوع پر بحث کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے

کہ کسی شخص یا ذات سے ہر قسم کا سوال یا شفاعت کی درخواست کرنا اس صورت میں عبادت سمجھا جائے گا جب کہ اس شخص یا ذات کو "الہٰ"، خدا "یا رب" اور جہانِ آفرینش کا "ہدایت کار" یا مبدا، یا خدائی کاموں کا انجام دینے والا تصور کریں اور اگر یہ تصور نہ کیا جائے تو کسی بھی صورت میں کوئی بھی سوال یا درخواست یا کسی بھی قسم کی تعظیم و تکریم عبادت میں شمار نہیں ہوگی۔

درگاہِ خداوندی کے حقیقی شفیعوں سے (وہ لوگ جنہیں خدا نے شفاعت کرنے کی اجازت دی ہے) شفاعت کی درخواست کرنا درحقیقت ان کو اس کی درگاہ کے مقرب و منتخب بندے سمجھنا ہے۔ خدا کی درگاہ کے یہ بندے نہ تو "خدا" ہیں اور نہ ہی خدائی کام مثلاً مغفرت و شفاعت وغیرہ کا حق ان کو دیا گیا ہے کہ خود اپنی مرضی سے، بغیر خدا کی اجازت کے جس کے بارے میں چاہیں شفاعت کریں یا اس کے گناہ سے درگزر کریں۔ یہ لوگ صرف "خدا کی اجازت" سے صرف کچھ لوگوں کے بارے میں ہی جو کہ خدا سے معنوی تعلق رکھتے ہیں اور جن کا شفیعوں سے روحانی رشتہ ہے ان کے گناہوں کو بخشش دینے کی درخواست اور مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی درخواست اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے جو کہ درخواست کرنے والے کی نظر میں خدا کی درگاہ کے مقبول بندوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کسی بھی صورت میں عبادت نہیں ہوگی۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر اس قسم کی درخواست شفاعت کرنے والے کی وفات کی صورت میں، شفیع کی پرستش ہے تو اس کی زندگی میں اس سے اس قسم درخواست فطری طور پر اس کی عبادت ہوگی۔

اس سے پہلے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن اور سنت کے ذریعے یہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ سے درخواست کریں کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں اس قسم کی درخواست کسی کی زندگی میں اس سے شفاعت کی درخواست کے سوا اور کچھ نہیں اور کسی بھی صورت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی عمل ایک وقت میں تو شرک ہو لیکن دوسرے موقع پر توحید بن جائے

۲۔ مشرکین کیونکہ بتوں سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے، ان کے سامنے گڑگڑاتے تھے اور ان سے وساطت کی درخواست کرتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہوتا ہے:۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (سورۃ یونس۔ آیت ۱۸)

اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

اس لیے غیر خدا سے کسی بھی قسم کی شفاعت کا مطالبہ کرنا، شفیع کی پرستش اور شرک کے مترادف ہوگا۔

جواب۔ ۱ : اول یہ کہ مذکورہ آیت کسی بھی صورت میں ان کے مقصود کو ثابت نہیں کرتی اور اگر قرآن کی نظر سے وہ مشرک ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بتوں سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے بلکہ ان کے مشرک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے تھے تاکہ ان کی شفاعت کریں۔

اگر بتوں سے شفاعت کی درخواست، درحقیقت ان کی پرستش تھی تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ "وَيَعْبُدُونَ" والے جملے کے علاوہ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا والا جملہ بھی لایا جائے۔

کیونکہ آیت میں یہ دو جملے "عطف" کے طور پر آئے ہیں اس لیے بتوں کی پرستش کا معاملہ ان کی شفاعت کی درخواست کے معاملے سے الگ معاملہ ہے۔ بتوں کی پرستش شرک اور دوگانہ پرستی کی علامت ہے اور لکڑی پتھر سے شفاعت کی درخواست کرنا ایک احمقانہ اور منطق سے دور عمل ہے۔

لہٰذا کسی بھی صورت میں اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بتوں سے شفاعت کی درخواست کرنا ان کی پرستش کے مترادف ہے کہاں یہ کہ یہ کہا جائے کہ درگاہ الٰہی کے مقرب و عزیز بندوں اور اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست کرنا، ان کی پرستش ہے۔

دوسرے یہ کہ فرض کیجیے ان کے شرک کی وجہ بتوں سے شفاعت کی درخواست کرنا ہے لیکن اس قسم کی شفاعت کی درخواست اور مسلمانوں کی شفاعت کی درخواست میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ بت پرست مشرکین بتوں کو شفاعت کا مالک اور گناہ کی بخشش اور شفاعت کے سلسلے میں انہیں درگاہ الٰہی کا صاحب اختیار تصور کرتے تھے چنانچہ مشرکین جو مذکورہ بالا عقیدہ رکھتے تھے ان کی طرف سے قدرتی طور پر اس قسم کی شفاعت کی درخواست ان کی عبادت کے مترادف ہوئی کیونکہ ان کو "الوہیت"، "ربوبیت" خدائی کاموں کا مبداء تصور کر کے ان سے شفاعت کی درخواست کی گئی ہے جب کہ ایک مسلمان اولیاء اللہ سے اپنی درخواست میں اس کو مقرب درگاہ الٰہی، آبرومند، شفاعت کے سلسلے میں خدا کی جانب سے عبد ماذون سمجھ کر اس سے شفاعت کی دعا کی درخواست کرتا ہے۔ ان دونوں قسموں کا باہم مقابلہ کرنا انصاف و حقیقت سے دور ہے۔

۳۔ غیر خدا سے حاجت کو پورا کرنے کی درخواست حرام ہے:

وہابیوں نے اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست کو حرام قرار دینے کی تیسری دلیل یہ دی ہے کہ قرآن کے حکم کے بموجب غیر خدا سے دعا نہیں کرنی چاہیے اور اس کے علاوہ کسی اور سے شفاعت کی درخواست کرنا غیر خدا سے حاجت کو پورا کرانے کی درخواست کے مترادف ہے اب کیونکہ:

قرآن میں کہا گیا ہے فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا خدا کے ساتھ غیر خدا کو نہ پکارو اس لئے (وہابیوں کے نظریئے کے مطابق) اگر علمائے اسلام کسی مقام پر جب کبھی یہ کہیں کہ غیر خدا کی شفاعت حرام ہے اور دوسری طرف یہ کہیں کہ اولیاء سے شفاعت کی درخواست ثابت شدہ ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ شفاعت اولیاء کو بھی خدا ہی سے چاہیں نہ یہ کہ خود اولیاء سے شفاعت کی درخواست کریں۔

اس بات کا ثبوت کہ اس قسم کی دعوتیں، عبادت اور پرستش ہیں مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ ہے کہ:۔

اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ

جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔

(سورۃ غافر - آیت ۶۰)

مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

ملاحظہ کیجئے آیت کے شروع میں "دعوت" کا لفظ اور آخر میں عبادت کا لفظ آیا ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دعوت اور عبادت کے ایک ہی معنی ہیں۔ اخلاقی کتابوں میں ان دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی بیان کیے گئے ہیں۔

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ "پرستش کی اصل حقیقت دعا ہے۔"

جواب: اول یہ کہ "فلا تدعوا" والا جملہ جس میں غیر خدا کی دعوت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کی آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے "ان المساجد للہ" یہ جملہ اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ اس آیت میں دعوت کو خاص معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو کہ پرستش کا لازمہ ہے یعنی وہ عبادت جس میں اس کے سامنے جس کو اللہ، خدا، صاحب اختیار اور حاکم مطلق سمجھتے ہیں بے انتہا خضوع دکھانا اور کسی بھی صورت میں یہ صفات اس شخص کے لیے نہیں ہیں جس کو خدا ہی نے اپنی طرف سے شفاعت کرنے کا حق عطا کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کسی کو خدا کے ساتھ ملائیں اور پکاریں اور اس کو خدا سمجھیں، "مع اللہ" کا لفظ اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے اب اگر کوئی پیغمبر سے یہ چاہے کہ اس کے لیے دعا کریں، خدا اس کے گناہوں کو بخش دے اور اس کی حاجت کو پورا کرے تو اس شخص نے کسی بھی صورت میں خدا کے ساتھ کسی کو نہیں ملایا ہے اور اس دعوت کی حقیقت، سوائے خدا کی دعوت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر کچھ آیات میں بتوں سے حاجت کو پورا کرنے کی درخواست کو شرک بتایا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جھوٹے خداؤں پر ایمان رکھتے تھے جو کہ خدا کے کچھ یا تمام کاموں کو انجام دینے پر قادر تھے اس لیے قرآن میں ان افکار کی تنقید کے طور پر فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۔

(سورۃ اعراف، آیت ۱۹۷)

ترجمہ: اور اس (اللہ) کو چھوڑ کر جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ نہ تو تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی مدد کرنے کے قابل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور مقام پر بھی ارشاد ہوا ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (سورۃ اعراف آیت ۱۹۴)

تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ مختصر یہ کہ مشرکین بتوں کو "جھوٹے خدا" تصور کرتے تھے ان کو خدائی کاموں میں صاحب اختیار سمجھتے تھے لیکن شفا و دعا کی درخواست ایک ایسے شخص سے جس کو خدا ہی نے یہ حق و مقام عطا کیا ہے ان سب چیزوں کی حامل نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ دعوت کے معنی وسیع ہیں اور شاید عبادت میں مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے آیہ "ادعونی استجب لکم" یا پھر الدعاء مخ العبادہ کے ضمن میں بتایا گیا ہے جس طرح اس قسم کے استعمالات کو اگر جزوی طور پر مجازی معنی میں ہوں تو ہمیشہ عبادت کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا اسی طرح کسی سے حاجت کو پورا کرنے اور دعا کی درخواست کو بھی اگر معقول شکل میں ہو تو شرک نہیں کہہ سکتے۔

لفظ "عبادت کے حقیقی معنی" بلانے کے ہیں جو کبھی عبادت کی شکل میں بھی ہے اور کبھی دوسروں کو دعوت کرنے کے معنی میں ہے جو کہ عبادت کی شکل میں ہو۔

۴۔ شفاعت کا تعلق صرف خدا سے ہے:

مندرجہ ذیل آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شفاعت کا تعلق صرف خدا ہی سے ہے اس لیے دوسروں سے شفاعت کرنے کے کیا معنی ہیں؟

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ

شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔

ترجمہ:

کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے ان سے کہدو کیا وہ (بت) شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہو؟ اور چاہے وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہدو شفاعت ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

جواب:

"للہ الشفاعۃ" والے جملے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف خدا ہی شفاعت کرتا ہے اور کسی دوسرے کو شفاعت کا حق حاصل نہیں کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کبھی خدا نے کسی بندے کے بارے میں شفاعت نہیں کی بلکہ مذکورہ جملے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بت صاحب و مالک شفاعت نہیں ہے کیونکہ شفاعت کا مالک وہ ہوتا ہے جو عقل و ادراک میں سے کوئی چیز رکھتا ہو جب کہ وہ بت جن کی پرستش کی جاتی ہے یہ دونوں چیزیں نہیں رکھتے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا...

اس لیے اس آیہ کریمہ میں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت کا مالک خداوند کریم ہے بت صاحب شفاعت نہیں ہیں اسی لیے خداوند عالم اپنے بندوں میں جس میں قابلیت دیکھتا ہے اسے اس امر کی اجازت دے دیتا ہے کہ وہ دوسرے بندگان خدا کی شفاعت کرے لہذا مذکورہ آیت کا ہماری بحث سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا کیونکہ مسلمان صرف خداوند عالم کو ہی مالک شفاعت سمجھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اولیائے کرام یا انبیائے خدا شفاعت کے مالک ہیں بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خداوند عزوجل جسے اجازت دیتا ہے وہی شفاعت کر سکتا ہے اور جناب رسول خدا (ص) کے بارے میں قرآنی آیات سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرما رکھی ہے اسی عقیدے اور نظریے کے تحت ہی مسلمان آنحضور (ص) سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں۔

۵۔ مردہ سے شفاعت کی درخواست بے معنی ہے

اس سلسلے میں وہابیوں کی آخری دلیل یہ ہے کہ اس دنیا میں اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست کرنا مردوں سے حاجت کو پورا کرنے کی درخواست کے مترادف ہے جو کہ سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس ضمن میں وہابیوں کا استدلال یہ ہے کہ:

قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مردے قوت درک و فہم سے محروم ہیں:

الف: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۔

(سورہ نمل۔ آیت۔ ۸۰)

ترجمہ:

تم مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔

قرآن نے اس آیت میں مشرکوں کو مردوں سے تشبیہ دی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس طریقے سے مردے کچھ نہیں سمجھ سکتے اسی طرح اس گروہ کو بھی کچھ سمجھانا مشکل ہوگا۔ اگر مردے بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوتے اور سن سکتے تو مردہ دل مشرکوں والی تشبیہ صحیح نہ ہوتی۔

ب: اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ

ترجمہ: بے شک خدا جسے چاہتا ہے اسے سمجھاتا ہے اور تم ان لوگوں کو جو قبروں میں سو رہے ہیں نہیں سن سکتے۔

مذکورہ بالا دلیل بھی اس سے پہلے والی دلیل کی طرح ہے اس لئے کسی مردہ شخص سے شفاعت کی درخواست، پتھر سے شفاعت کی درخواست کی طرح ہوگی۔

جواب:

وہابی مسلسل دوسرے اسلامی فرقوں پر تنقید کرنے کے لئے شرک کے ہتھیار کا استعمال کرتے ہیں اور توحید کے نام پر ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔ اس دلیل میں انہوں نے اپنی زبان بدل دی ہے اور صرف کہتے ہیں کہ اولیائے سے درخواست بے معنی ہے شاید وہ نہیں جانتے کہ اولیائے خدا شرعی احادیث کی دلیلوں کی بنیاد پر زندہ ہیں اور مذکورہ آیت کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ جسم

سو رہے ہیں قابلِ ہدایت نہیں ہیں کیونکہ جب کسی بدن سے روح نکل جاتی ہے تو وہ ادراک و فہم سے خارج ہو جاتا ہے اور جمادات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

بدن سے جدا ہونے کے بعد نفس کے مادہ سے الگ ہونے کے سلسلے میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ جسد مادی کی یہ ضرورت ہے کہ موت کے بعد بھی انسانی روح باقی رہے اور خاص قسم کے ادراک و زندگی سے بھرپور ہو مسلمان فلاسفروں نے روح کے زندہ رہنے اور اس کی برتری کے بارے میں دس دلائل پیش کیے ہیں اور کسی بھی باانصاف شخص کو زیب نہیں دیتا کہ اس بارے میں شک کرے۔

لیکن اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں سے ہم مخاطب ہیں وہ قبروں میں سوئے ہوئے جسم نہیں ہیں بلکہ ان کی وہ روحیں ہیں جو برزخی جسم کے ساتھ عالم برزخ میں ہیں۔ قرآن کی واضح عبارت کے مطابق وہ زندہ ہیں بات کرتے ہیں اور ہمارے لئے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں ہمارا ان کے خاک میں پڑے ہوئے جسموں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اگرچہ مُردے اور وہ بدن جو مٹی کے نیچے پڑے ہوئے فہم و ادراک سے دور اور خارج ہیں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ ان کی پاک روحیں بھی کچھ نہیں سُن سکتیں کیونکہ قرآن کی واضح عبارت میں وہ دوسری دنیا میں زندہ و سلامت ہیں۔

اگر ہم ان کو سلام کرتے ہیں یا ان سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں یا بات کرتے ہیں تو ہم ان کی پاک و زندہ روحوں سے تعلق قائم کرتے ہیں نہ ان کے ان جسموں سے جو مٹی کے نیچے ہیں اگر ہم ان کی قبروں کی زیارت کے لئے جاتے ہیں تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان سے روحانی رابطہ برقرار رکھنے کیلئے خود کو تیار کریں حتیٰ کہ اگر ہم کو یہ بھی معلوم ہو کہ ان کے بدن خاک ہو چکے ہیں۔ (حالانکہ احادیث اس بات کو غلط بتاتی ہیں)

○

باب ۱۳

کیا غیبی طاقت پر اعتقاد شرک ہے؟

اس میں شک نہیں کہ حاجت کو پورا کرنے کی درخواست صحیح طور پر اس صورت میں امکان پذیر ہے جبکہ درخواست کرنے والا اس شخص کو جس سے درخواست کی جا رہی ہے اپنی درخواست کو پورا کرنے پر قادر سمجھتا ہو۔

کبھی یہ ظاہری اور مادی طاقت ہے۔ مثال کے طور پر کسی سے پانی مانگیں اس نے پیالے میں پانی یا دودھ بھر کر ہمیں دے دیا جبکہ اس کے برعکس کبھی یہی طاقت فطری اور مادی قوانین سے ماوراء غیبی طاقت ہوتی ہے۔ جیسے مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ حضرت علیؑ نے خیبر کے دروازے کو انسانی طاقت سے نہیں بلکہ غیبی قوت سے اکھاڑ پھینکا تھا اس لئے کہ یہ کام عام انسانی طاقت سے بعید ہے۔ اسی طرح یہ ماننا کہ حضرت عیسیٰؑ اس صورت میں جبکہ بیمار نے نہ دوا کھائی اور

نہ ہی اس کا کوئی آپریشن ہوا اپنے شفا بخش دم سے اسے شفا عطا کر دی تو اس قسم کی غیبی طاقت پر ایمان خدا کی مشیت، اس کی قدرت اور اس کی حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ کوئی بھی کام اس (اللہ) کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے تو یہ ہرگز شرک نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ وہ خدا جو کسی کو مادی طاقت عطا کر سکتا ہے وہ اسی بندے کو غیبی طاقت بھی عنایت کرنے پر قادر ہے۔

وہابیوں کا عقیدہ

وہابی کہتے ہیں کہ اگر کوئی کسی ولی خدا سے اس کے زندہ و مردہ ہونے کی صورت میں یہ درخواست کرے کہ اس کے بیمار کو شفا بخشے، کھوئے ہوئے کو ملا دے یا اس کے قرض کو ادا کر دے وغیرہ تو اس درخواست کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ شخص اس شخص کے بارے میں جس سے یہ سب کچھ کرنے کو کہہ رہا ہے ایسی طاقت کا معتقد ہے جو اس دنیا کے فطری اور جاری قوانین پر حکم فرما ہے اور غیر خدا میں اس قسم کی طاقت موجود ہونے پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس شخص کی "الوہیت" کے قائل ہیں اگر اس تصور کے ساتھ حاجت کو پورا کرنے کی درخواست کی جائے تو یہ عمل شرک ہے۔

اگر کسی ریگستان میں کوئی پیاسا آدمی اپنے نوکر سے پانی مانگے تو اس نے یہ کام فطری قوانین کے مطابق انجام دیا ہے اور یہ کام شرک نہیں ہے لیکن اگر امام یا کسی نبی سے جو مٹی کے نیچے محو خواب ہے یا کسی اور جگہ ہے پانی مانگا جائے اور وہ درخواست کرنے والے کو پانی پہنچا دے تو اس صورت میں اعتقاد اس کی "الوہیت" کے قائل ہونے کے مساوی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس بات کی تشریح کی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ:

إِنَّ التَّصَوُّرَ الَّذِي لِأَجْلِهِ يَدْعُو الْإِنْسَانُ الْإِلٰهَ وَيَسْتَغِيثُهُ وَيَتَضَرَّعُ إِلَيْهِ هُوَ لَا جَرَمَ تَصَوُّرُ كَوْنِهِ مَالِكًا لِلسُّلْطَةِ الْمُهَيْمِنَةِ عَلَىٰ قَوَانِينِ الطَّبِيعَةِ۔ (المصطلحات الاربعہ۔ ص ۱۸)

ترجمہ:

اس بات کا سبب کہ انسان خدا کو پکارتا ہے اور اس سے مدد چاہتا ہے یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا قوانین فطرت اور ان طاقتوں پر جو مادی قوانین کی حدود سے باہر ہیں غلبہ رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا نظریے کے بارے میں ہمارا عقیدہ

اس نظریے میں بنیادی غلطی یہ تصور ہے کہ انسان میں غیبی طاقت کے وجود پر اعتقاد رکھنا شرک اور دوگانہ پرستی ہے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو موصوف خدا سے الگ مستقل غلبے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان فرق کرنا ہی نہیں چاہتے یا پھر یہ کہ وہ اس فرق کو تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ ورنہ قرآن مجید میں تو واضح الفاظ کے ساتھ ان ذوات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو غیبی طاقت کی مالک تھیں اور جن کی نیت اور ارادہ فطری قوانین پر حکم فرما تھا۔

ذیل میں ہم ان چند ذوات کا ذکر کر رہے ہیں جو قرآن حکیم کے مطابق غیبی طاقت رکھتی تھیں۔

۱۔ حضرت یوسف کی غیبی طاقت

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا۔
فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا۔

(سورۂ یوسف۔ آیات ۹۳۔ ۹۶)

ترجمہ:

میری یہ قمیض لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو ان کی بینائی پلٹ آئے گی پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسفؑ کی قمیض یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دی اور یکایک ان کی بینائی عود کر آئی۔

آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی اپنی طاقت اور ارادے سے ہی حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی بینائی عود کر آئی۔ یہ کام براہِ راست خدا کا کام نہیں تھا بلکہ خدا نے سبب پیدا کیا کہ وہ اپنے بھائیوں کو حکم دیں کہ ان کی قمیض کو ان کے والد کے منہ پر ڈال دیں۔ یہ بھی کافی تھا کہ صرف دعا ہی کرتے اس عمل کو سوائے خدا کے حکم سے اس کے کاموں میں اس کے ولی کے تصرف کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس کام کا کرنے والا وہ غیبی طاقت رکھتا ہے جو خداوند عالم نے خصوصی طور پر اس کو عطا کی ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ کی غیبی طاقت

حضرت موسیٰؑ کو خداوند عالم کی جانب سے حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی لاٹھی کو پہاڑ پر ماریں تاکہ اسرائیلی قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے اُبل پڑیں:

اَضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ

(سورہ بقرہ - آیت ۶۰)

ترجمہ:

ہم نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارے تاکہ اس میں سے بارہ چشمے اُبل پڑیں۔
دوسری جگہ حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی لاٹھی کو سمندر پر مارو تاکہ جس قدر بھی سمندر ہیں اس میں سے بنی اسرائیل گزریں:

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ

(سورہ شعرا - آیت ۶۳)

ترجمہ:

ہم نے موسیٰؑ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ "مارو اپنا عصا سمندر پر" اور اس کا ہر ٹکڑا عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔

یہاں پر موسیٰؑ کے ارادے اور ان کے لاٹھی مارنے کو جس کی وجہ سے چشمے اور پہاڑ ظاہر ہو گئے بے اثر نہیں کہا جاسکتا۔

۳۔ حضرت سلیمانؑ کی غیبی طاقت

حضرت سلیمانؑ خداوند عالم کے ان عظیم انبیاء میں سے ہیں جن کو وسیع غیبی طاقت حاصل تھی وہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں سے اس قدر مالا مال تھے کہ کہا گیا ہے۔

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۖ (سورۃ نمل آیت ۱۶) اس کے علاوہ قرآن مجید کے سورۃ انبیاء کی ۳۶، ۴۰ اور ۸۱ ویں آیات میں بھی تفصیل سے ان نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان آیات کا مطالعہ حضرت سلیمان نبی پر اللہ کی نعمتوں سے روشناس کراتا ہے یہاں پر مختصر طور پر اس نبی خدا سے متعلق کچھ آیات کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کے نیک بندوں کی غیبی طاقت کا مسئلہ ایسی بات ہے جس کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق حضرت سلیمان جن اور پرندوں پر غلبہ و حکم فرمائی کرتے تھے اور ان کی زبان جانتے تھے جیسا کہ کہا گیا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۖ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ

(سورہ نمل - آیات ۱۶ تا ۱۹)

ترجمہ:

اور حضرت داؤد کے وارث حضرت سلیمان ہوئے اور اس نے کہا: لوگو! مجھ کو پرندوں کی بولیاں سکھائی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے" حضرت سلیمانؑ کے لئے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا یہاں تک کہ جب

سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمانؑ اور اسکے لشکر والے تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ سلیمان اس کی بات پر مسکرائے اور بولے اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والد پر کیا ہے۔

اگر آپ قرآن میں حضرت سلیمانؑ کی طرف سے ملکہ سبا کو پیام پہنچانے کے لئے "ہد ہد" کی داستان کا مطالعہ کریں تو حضرت سلیمانؑ کی غیبی طاقت کے بارے میں انگشت بدنداں نظر آئینگے آیات ۴۰ سے ۴۴ تک میں مندرجہ ذیل نکات کا مطالعہ فرمایئے۔

حضرت سلیمانؑ قرآنی آیات کے مطابق غیبی طاقت رکھتے تھے اور حتیٰ کہ ہوا بھی ان ہی کے حکم سے چلتی تھی؛

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا
فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ۔

(سورۂ انبیاء آیت - ۸)

اور سلیمان کے لئے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔

قابلِ توجہ نکتہ "تجری بامرہ" والے جملے میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہوا ان کے حکم سے چلتی تھی۔

۵۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی غیبی طاقت

قرآن کی آیات کے مطالعے سے حضرت عیسیٰ کی غیبی طاقت کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے۔ ہم حضرت عیسیٰؑ کے مقام کی جانب اشارہ کرنے کے لئے قرآن مجید سے ایک آیت بیان کرتے ہیں۔

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

حضرت عیسیٰؑ نے کہا میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

(سورۂ آلِ عمران - آیت - ۴۹)

اگر حضرت عیسیٰؑ اپنے کاموں کو خدا کے حکم سے متعلق بتاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی بغیر خدا کے حکم کے اس خصوصیت کا حامل نہیں ہو سکتا:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (رعد - ۳۸)

کوئی بھی رسول بغیر خدا کی اجازت کے معجزہ نہیں دکھا سکتا۔

لیکن اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ غیبی کاموں کو اپنے سے متعلق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں صحت بخشتا ہوں، زندہ کرتا ہوں اور بتاتا ہوں یا اطلاع دیتا ہوں وغیرہ "ابرئ، احیی، انبئکم" وغیرہ تمام جملے متکلم کے صیغے ہیں اور اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے ان اعمال کو اپنی ذات سے نسبت دی ہے۔

صرف یوسفؑ، موسیٰؑ، سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ ہی نہیں ہیں جو غیبی طاقت رکھتے ہیں بلکہ دیگر انبیا اور فرشتے بھی یہ غیبی طاقت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں اور قرآن میں جبرئیل کو "شدید القویٰ" اور فرشتوں کو "والمدبرات امراً" سے مثال دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں فرشتوں کو اس دنیا کے کاموں کا منتظم، جان لینے والے، انسان کے محافظ و نگہبان اعمال تحریر کرنے والے باغی قوموں کو نابود کرنے والے کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے لہٰذا جو بھی قرآن مجید کی الف ب سے واقفیت رکھتا ہے جانتا ہے کہ فرشتے غیبی طاقت کے مالک ہیں اور خدا کی قدرت و اجازت سے غیر معمولی کام انجام دیتے ہیں۔

اگر غیبی طاقت کے بارے میں اعتقاد "الوہیت" کے تصور کے ساتھ ہو تو قرآن کی نظر میں ان سب کو اللہ بیان کیا جانا چاہئیے؟

راہ حل وہی ہے جو بیان کی گئی اور وہ یہ کہ "مستقل طاقت" اور "حاصل شدہ طاقت" کے درمیان فرق کریں کسی بھی سلسلے میں "مستقل طاقت" پر ایمان شرک ہے جبکہ حاصل شدہ طاقت پر عقیدہ رکھنا توحید ہے۔

یہاں تک یہ واضح کیا گیا ہے کہ اولیائے خدا کی غیبی طاقت پر "اعتقاد جو کہ خدا کی لایزالی قدرت پر مبنی ہو اور ان کو اس بات کا سبب تصور کریں جس کے لے خدا نے ان کو پیدا کیا ہے تو یہ اعتقاد نہ صرف لازمی طور پر شرک نہیں ہے بلکہ عین توحید ہے۔ توحید کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ کام جو فطری طاقتوں پر مبنی ہیں خدا سے متعلق تصور کریں بلکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ تمام کاموں کو خدا ہی سے متعلق سمجھیں۔

اور اب ذیل میں اولیائے خدا سے غیر معمولی کاموں کی درخواست کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

کیا غیر معمولی کاموں کو انجام دینے کی درخواست شرک ہے

ہر اتفاق جو پیش آتا ہے اس کے لئے "علت و معلول" کے قانون کا ہونا ضروری ہے کیونکہ بغیر کسی علت کے کسی اتفاق کا ہونا ممکن نہیں ہے اور اس دنیا میں کوئی بھی اتفاق بغیر علت کے نہیں پیش آتا۔

اولیاً اور انبیاً کی کرامات اور معجزے بھی بغیر کسی علت کے نہیں ہوتے، نکتہ صرف یہ ہے کہ علت کو مادی اور فطری علت میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس بات سے الگ بات ہے اگر کہا جائے کہ ان کے لئے کوئی علت نہیں ہے۔

اگر حضرت موسیٰ کی لاٹھی سانپ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، مُردے حضرت عیسیٰ کے ذریعے زندہ ہو جاتے ہیں نبیؐ چاند کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں اور کنکریاں رسول اللہؐ کے ہاتھ میں تسبیح بن جاتی ہیں وغیرہ۔۔۔۔ تو یہ ساری چیزیں بغیر علت کے نہیں ہیں اگرچہ ان معاملات میں واضح فطری یا مادی علت کا وجود نہیں ہے تاہم بنیادی طور پر ان میں علت وجود رکھتی ہے۔

کیونکہ بعض کا عقیدہ ہے کہ فطری کاموں کے لئے درخواست کرنا شرک نہیں ہے لیکن غیر معمولی کاموں کے لئے درخواست کرنا شرک ہے۔ لہٰذا ذیل میں اسی نظریہ کا مطالعہ کیا جائے گا۔

جواب:

قرآن مجید میں کچھ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں انبیاً کے علاوہ دوسرے افراد سے کچھ ایسے غیر معمولی کاموں کے سلسلے میں درخواست کی گئی ہے جو فطری و مادی قوانین کی حدود سے باہر ہیں۔ قرآن میں ان درخواستوں کو بلا کسی تنقید کے بیان کیا گیا ہے مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰ سے کہا کہ پانی وبارش کی درخواست کریں تاکہ وہ خشک سالی سے نجات حاصل کریں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ۔

(سورۂ اعراف - آیت ۱۶۰)

اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ زندہ لوگوں سے غیر معمولی کاموں کی درخواست میں کوئی برائی نہیں ہے۔ البتہ مردوں سے یہ درخواست جائز نہیں تو اس بات کا جواب واضح ہے کیونکہ موت و زندگی اس کام میں جو توحید کے مطابق ہو فرق پیدا نہیں کرتی اور وہ بھی اس طرح کہ ایک کو شرک اور دوسرے کو عین توحید قرار دیا جائے۔ زندگی و موت کسی کام کے مفید ہونے یا مفید نہ ہونے کے سلسلے میں تاثیر پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن کسی چیز کے شرک یا توحید قرار دینے میں نہیں۔

حضرت سلیمانؑ بلقیس کے تخت کو منگواتے ہیں

حضرت سلیمان نے بلقیس کے تخت کو لانے کے سلسلے میں حاضرین سے غیر معمولی کام کرنے کو کہا!

اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ۔

(سورۂ نمل - آیت ۳۸ - ۳۹)

سلیمانؑ نے کہا تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں۔ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا میں اسے حاضر کردوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو نبوت کے مدعیوں سے ہر زمانے میں معجزہ کی درخواست کو کفر و شرک شمار کرنا چاہیے کیونکہ لوگ نبوت کے مدعی سے (دعویٰ کرنے والے سے) غیر معمولی کام یعنی معجزہ دکھلانے کو کہتے تھے۔

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۰۶)

اگر سچ کہتے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔

کیونکہ نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے مقابلے میں سچے نبی کو پہچاننے کے لیے تمام قومیں معجزات کا مطالبہ کرتی تھیں اور انبیاؑ بھی مسلسل تمام قوموں کو دعوت دیا کرتے تھے کہ آئیں اور ان کے معجزات کو دیکھیں لہٰذا قرآن میں بھی نبوت کے ان مدعیوں کی مختلف قوموں سے معجزہ کی درخواست کے بارے میں بات چیت کو بلا کسی انکار کے بیان کیا گیا ہے جو کہ درخواست کے مقبول ہونے کی دلیل ہے۔

اگر کوئی قوم جستجو کی راہ میں کسی مسیحا کے پاس جائے اور کہے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس نابینا یا کوڑھ کے مریض کو شفا عطا کرو تو یہ نہ صرف یہ کہ شرک نہیں ہوگا بلکہ اس کا شمار حقیقت کو تلاش کرنے والوں میں ہوگا اور اس سلسلے میں قابل ستائش قرار دیے جائیں گے۔ اب اگر حضرت عیسیٰؑ کے گزرنے کے بعد ان کی امت ان کی پاک روح سے یہ چاہتی ہے کہ ان کے بیمار کو شفا عطا کریں تو اس کو کیوں مشرکوں میں شمار کریں جبکہ حضرت عیسیٰ کی موت و زندگی کا شرک و توحید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(حضرت عیسیٰ کے معجزات کو دیکھنے کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران آیت ۴۹۔ مائدہ ۱۱۰۔ اور ۱۱۱)

مختصر یہ کہ قرآن کی روشنی میں خدا کے بعض برگزیدہ بندے غیر معمولی کاموں کو انجام دینے کی طاقت رکھتے تھے اور کچھ معاملات میں اس طاقت کو استعمال کرتے تھے کچھ لوگ بھی ان کے پاس جاتے تھے اور درخواست کرتے تھے کہ اس طاقت کو استعمال کریں۔ اگر وہابی یہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص

ان معاملات کو انجام دینے پر قادر نہیں ہے تو مذکورہ آیات ان کی نفی کرتی ہیں۔

اگر وہ کہتے ہیں کہ اس طریقے سے کسی کام کی درخواست شرک ہے تو سلیمانؑ وغیرہ نے کیوں درخواست کی؟ اگر وہ کہتے ہیں کہ اولیائے غیر معمولی طور پر کسی کام کو پورا کرنے کی درخواست ان کے غیبی تسلط یا طاقت پر اعتقاد کے برابر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی و موت شرک و توحید کا معیار نہیں ہے۔

اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ غیر معمولی ذریعوں سے کاموں کو انجام دینے کی درخواست اور بیمار کی شفا کی دعا وغیرہ۔ خدائی کاموں کو غیر خدا سے چاہنے کی درخواست ہے تو ہم کہتے ہیں کہ شرک کا معیار یہ ہے کہ اس کام کے انجام دینے والے کو خدا یا خدائی کاموں کا مبداء تصور کریں۔ کسی غیر فطری کام کی درخواست، غیر خدا سے خدائی کام کو انجام دینے کی درخواست نہیں ہے کیونکہ خدائی کاموں کا معیار یہ نہیں ہے کہ عام قوانین کی حدود سے بالاتر ہوں تاکہ اس قسم کی درخواستیں یعنی خدا کے کام کو انجام دینے کی درخواست اس کے بندے سے کی جائے بلکہ خدائی کام کا معیار یہ ہے کہ فاعل یعنی کام کو انجام دینے والا آزاد و مستقل ہو۔ اور اگر کوئی فاعل کسی کام کو خدائی طاقت کے بھروسہ پر انجام دے تو اس قسم کے کام کی درخواست یعنی خدائی کام کو انجام دینے کی درخواست غیر خدا سے نہیں ہے خواہ یہ کام عادی اور معمولی ہو یا غیر معمولی۔

خدا کے بندوں سے شفا کی درخواست کرنے کے بارے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اولیائے بیمار کی شفا۔ کی درخواست وغیرہ غیر خدا سے خدائی کام کو انجام دینے کی درخواست کے مترادف ہے جبکہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔

اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔

اس کے باوجود یہ کیوں کہتے ہیں کہ اے پیغمبر ہمارے بیمار کو شفا عطا فرما اور اسی سلسلے میں وہ تمام دعائیں اور درخواستیں ہیں جن میں غیر معمولی کام کو انجام دینے کا پہلو موجود ہے۔

جواب:

کیونکہ ان لوگوں نے خدائی اور انسانی کاموں میں فرق نہیں کیا اور اسی لیے خیال کرتے

ہیں کہ ہر وہ کام جو اپنی فطری حالت سے خارج ہو اس کو خدائی کام سمجھنا چاہیے اور ہر وہ کام جس میں فطری و مادی پہلو روشن ہے اس کو انسانی کام سمجھنا چاہیئے۔

ان لوگوں نے یا تو نہیں چاہا یا یہ کہ وہ خدائی اور غیر خدائی کاموں کے درمیان معیار کو سمجھنے سے قاصر ہیں یہ معیار کسی بھی صورت میں انسانی، عادی اور غیر عادی خدائی کاموں کی تقسیم میں نہیں ہے ہنیں تو سادھوں کے کام کو خدائی کام کہنا چاہیے اور ان کو "الہ" تصور کرنا چاہیے۔

خدائی کاموں کا معیار یہ ہے کہ کام کا کرنے والا اپنے کام کا مالک و مختار ہو اور کسی دوسرے سے مدد حاصل نہ کرے۔ اگر کوئی انسان ایسا کر سکے تو اس کے کام خدائی کام ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنے کام کو خدائی طاقت کے سایہ میں انجام دے تو اس کا یہ عمل غیر الٰہی ہوگا خواہ اس میں عادی و مادی پہلو بھی شامل ہو یا عادی حالت سے خارج ہو۔

انسان ہر کام کو انجام دینے میں خواہ وہ عادی ہو یا غیر عادی اور فطری قوانین سے خارج خدا پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا ہی کی طاقت سے مدد کی درخواست کرتا ہے جس کام کو بھی انجام دیتا ہے ایسی قدرت کے سایہ میں انجام دیتا ہے جو کہ اس نے خدا سے حاصل کی ہے۔ اس صورت میں اس قسم کی طاقت رکھنا، کاموں کو انجام دینے میں اس کا استعمال کرنا اور اس کو استعمال کرنے کی درخواست وغیرہ کوئی بھی شرک نہیں ہے کیونکہ تمام مرحلوں میں کہتے ہیں کہ خدا نے اس کو یہ طاقت عطا کی ہے اور اس کو اجازت دی ہے کہ اس کو استعمال کرے۔

جناب حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی دامت برکاتہ خدائی کاموں کو پہچاننے کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

خدائی کام وہ کام ہے جس میں کام کا کرنے والا کسی دوسرے کی مداخلت اور کسی دوسرے کی مدد کے بغیر اپنے کام کو انجام دے۔

دوسرے لفظوں میں خدائی کام وہ ہے جس کا کرنے والا آزاد و مستقل ہو نیز دوسروں کی مدد سے بے نیاز ہو جبکہ غیر خدائی کام بالکل اس کے برعکس ہیں۔

خداوند عالم دنیا کی تخلیق کرتا ہے، روزی دیتا ہے، صحت و شفا بخشتا ہے اس کے یہ سارے

کام بغیر کسی دوسرے کی مدد کے انجام پاتے ہیں کوئی بھی کلی یا جزوی طور پر اس کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس کی قدرت و طاقت کہیں اور سے نہیں آتی۔

لیکن اگر غیر خدا کسی کام کو انجام دے خواہ وہ معمولی اور آسان ہو یا غیر معمولی اور مشکل کام ہو۔ خود اپنی طاقت و قدرت سے اس کام کو انجام نہیں دیتا اور نہ ہی قدرت و طاقت ہی خود اس کی اپنی قدرت و طاقت ہے۔ (دیکھئے کشف الاسرار۔ ص۔ ۵۱)

واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں؛ جب بھی کسی موجود کے لئے وجود یا تاثیر کے لحاظ سے کسی بھی قسم کے استقلال کے قائل ہو جائیں تو توحید کی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ کیونکہ کسی موجود کی آزادی یا استقلال پر ایمان ایسی ہستی پر ایمان ہے جو اپنی ہستی کے سلسلے میں خدا سے بے نیاز ہونے کے مترادف ہے اور ایسا کوئی وجود نہیں ہے سوائے خدا کے جو کہ ہستی میں کسی بھی چیز کا نیازمند نہیں ہے۔ اور جس کا وجود خود اسی سے متعلق ہے۔

اسی طرح اگر اس کے وجود کو خدا کی ہی مخلوق سمجھیں لیکن اس بات پر ایمان رکھیں کہ دنیا اور بندوں کے معاملات اس کو سونپے گئے ہیں اور وہ ان کاموں کی تدبیر کے سلسلے میں خود صاحب استقلال ہے تو اس سلسلے میں شرک کے مرتکب ہوں گے۔

• زمانہ جاہلیت اور ظہورِ اسلام کے زمانہ میں بہت سے مشرکوں کا عقیدہ یہی تھا۔ وہ معتقد تھے کہ فرشتے اور ستارے جو کہ مخلوق میں شامل ہیں۔ مدبر جہاں ہیں اور کم سے کم خدائی کاموں میں سے کچھ کام مثلاً شفاعت اور مغفرت وغیرہ ان کو سونپی گئی ہے اور اس سلسلے میں ان کو پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

(جب عمرو بن لحی نے بتوں کی پرستش کا سبب دریافت کیا تو شام کے لوگوں نے کہا کہ ہم ان سے بارش کی دعا کرتے ہیں، وہ ہمارے لئے بارش کرتے ہیں، مدد چاہتے ہیں، مدد کرتے ہیں (اور وہ اس عقیدہ کی بنا پر ہبل نامی بت کو اپنے ساتھ مکہ لے کر آئے تھے)

(دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ج ۱۔ ص ۷۷)

معتزلہ ہستی کے لحاظ سے انسان کو مخلوق خدا مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اثر اور کاموں کے انجام دینے کے سلسلے میں اس کی آزادی و استقلال کے قائل ہیں۔ اگر یہ

حضرات اپنے نظریے کا غور سے مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ اس قسم کا عقیدہ ایک قسم کا شرک خفی ہے خواہ یہ شرک، مشرکوں کے شرک کی طرح ہو لیکن ان دونوں شرکوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ ان میں ایک اس بات کا مدعی ہے کہ دنیا کے معاملات میں تدبیر و فکر خدا کا کام ہے اور دوسرا مدعی ہے کہ انسان کو اپنے کاموں میں آزادی و استقلال حاصل ہے۔

باب ۱۴

خدا کو اولیا کے مقام وحیثیت کی قسم دینا

"وہابی" مندرجہ ذیل دو قسم کی قسموں کو حرام یا غالباً عبادت میں شرک کا مرتکب ہونا تصوّر کرتے ہیں اور یہ نظریہ باقی دوسرے اسلامی فرقوں سے اختلافِ نظر کا باعث ہے۔

۱۔ خدا کو اولیاؑ کے مقام وحیثیت کی قسم دینا۔

۲۔ غیر خدا کی قسم کھانا۔

یہاں اس باب میں اسی موضوع پر بحث کی جائے گی۔

شرک اور خدا کو اولیاؑ کے مقام کی قسم دینا

قرآن مجید میں بعض لوگوں کی اس طرح ستائش کی گئی ہے

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۔

(سورہ آل عمران - ۱۷)

یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راست باز ہیں، فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص نصف شب عشاء کی نماز کے بعد قبلہ رو ہو کر خدا کو ان لوگوں کے مقام و حیثیت کی قسم دے اور کہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ اِغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ۔

اے خدا سحرگاہ میں استغفار کرنے والوں کے صدقے میرے گناہوں کو بخش دے۔

تو اس عمل کو کس طرح عبادت میں شرک کا مرتکب قرار دے سکتے ہیں کیونکہ عبادت میں شرک یہ ہے کہ غیر خدا کی پرستش کریں اور غیر خدا کو خدا یا خدائی کاموں کا مبداء سمجھیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا دعا میں ہم نے خدا کے علاوہ اور کسی جانب توجہ نہیں کی ہے۔ اور سوائے اس کے کسی اور سے کچھ نہیں مانگا ہے۔

اس لئے اگر اس عمل کو حرام قرار دیا جائے تو شرک کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی ہونی چاہیے یہاں پر ہم وہابیوں کو ایک نکتہ بتانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں مشرک کو موحد سے الگ کرنے کے لئے (البتہ عبادت میں شرک کے لئے ایک اصول بیان کیا گیا ہے) اور اس طریقے سے مشرک کے بارے میں ہر قسم کی من گھڑت تفسیر کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ قرآنی اصول ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔

جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں

(سورہ زمر آیت - ۴۵)

ایک دوسری آیت میں مشرکوں کو مجرم قرار دیا گیا ہے اور اس طرح ان کی تعریف کی گئی ہے

اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ وَيَقُوْلُوْنَ

اَئِنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۔ (صافات ۳۵-۳۶)

جب ان سے کہا جاتا کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے اور کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

مندرجہ بالا آیات کے مدنظر:

مشرک وہ ہے جس کا دل خدا کی یاد سے متنفر ہو جاتا ہو اور جو دوسروں کی یاد یعنی جھوٹے خداؤں کی یاد سے خوش ہو جاتا ہو یا جو خدا کی وحدانیت کو قبول کرنے کے مقابلے میں گھمنڈ سے کام لیتا ہو اور کسی بھی قیمت پر اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ غیر خدا کی عبادت کو ترک کرے۔

اس معیار کے مطابق وہ شخص مشرک نہیں ہے جو آدھی رات کی تاریکی میں سوائے خدا کے کسی کو نہیں پکارتا، اس کی یاد سے لذت حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ خواب شیریں کو خود پر حرام کر لیتا ہے اور اس کی مناجات میں مشغول رہتا ہے اور خدا کو اس کی درگاہ کے مقبول موحد بندوں کی قسمیں دیتا ہے، وہ کب خدا کی یاد سے کڑھتا ہے اور کب خدا کی وحدانیت کو قبول کرنے کے مقابلے میں گھمنڈ کرتا ہے؟

کس لئے وہابی مصنفین نے جعلی اور بے بنیاد اصول بنا کر تمام موحدوں کو مشرک قرار دیا ہے اور اپنے آپ کو درگاہ خداوندی کے مقبول بندوں میں شمار کیا ہے؟

مندرجہ بالا بیان شدہ اصول کے مدنظر ۹۹ فیصد اہل قبلہ کو مشرک۔ اور نجدیوں کو "موحد" قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ "عبادت میں شرک" کی تفسیر بیان کریں یا جس طرح چاہیں اس کی تفسیر کریں اور جس کو چاہیں مشرک قرار دے دیں۔

خدا کو اولیاء کی قسم دینے کے سلسلے میں حضرت علیؑ کا نظریہ

حضرت علی علیہ السلام کی دعاؤں میں بھی اس قسم کی قسمیں بکثرت ملتی ہیں۔ روایات سے

پتا چلتا ہے کہ جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام نماز تہجد کے نوافل بجالانے کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحُرْمَۃِ مَنْ عَاذَ بِکَ مِنْکَ وَلَجَأَ اِلٰی عِزِّکَ وَاسْتَظَلَّ بِفَیْئِکَ وَاعْتَصَمَ بِحَبْلِکَ وَلَمْ یَثِقْ اِلَّا بِکَ۔

(صحیفۂ علویہ - طبع انتشارات اسلامی - ص - ۳۷)

اے پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اس شخص کے احترام میں جو توبہ سے تیری پناہ میں ہے (جس نے تیرے علاوہ کسی اور کی پناہ کا تصور بھی نہیں کیا) تیری عزت کا واسطہ دیتا ہے اور تیرے سائے میں ہے اور تیری ہی رسّی کو پکڑے ہوئے ہے اور جس نے تیرے علاوہ کسی اور سے دل نہیں لگایا۔

ذیل میں وہ دعا بیان کی جاتی ہے جو حضرت علیؑ نے اپنے ایک دوست کو بتائی

وَبِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْکَ وَالرَّاغِبِیْنَ اِلَیْکَ وَالْمُتَعَوِّذِیْنَ بِکَ وَالْمُتَضَرِّعِیْنَ اِلَیْکَ وَبِحَقِّ کُلِّ عَبْدٍ مُتَعَبِّدٍ لَکَ فِیْ کُلِّ بَرٍّ اَوْ بَحْرٍ اَوْ سَھْلٍ اَوْ جَبَلٍ اَدْعُوْکَ دُعَاءَ مَنِ اشْتَدَّتْ فَاقَتُہٗ (صحیفہ علویہ ص - ۵۱)

ترجمہ:

بارالٰہا: تجھ سے سوال کرنے، دعا کرنے اور تیری پناہ حاصل کرنے والوں کے صدقے میں اور تیری بارگاہ میں خضوع کرنے دُعا کرنے والوں اور تیری عبادت کرنے والے ہراس بندے کے صدقے میں جو خشکی، پانی، صحراؤں، پہاڑ اور دیگر مقامات پر تیری عبادت و پرستش کرتا ہے تجھ کو پکارتا ہوں بالکل اس شخص کی مانند ہے جس کی پریشانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔

قابلِ غور و فکر ہے یہ بات کہ بارگاہِ خداوندی میں اس قسم کی روح افزا مناجات اور اپنی ذلت و پستی کا اظہار توحید کے عقیدے کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی بجائے کیونکر "شرک" کا ارتکاب کہلا سکتا ہے؛ یہ مناجات جو درحقیقت خدا کے نیک اور پرہیزگار بندوں سے اظہارِ محبت اور خداوند عزّ وجل کی طرف تہہ دل سے متوجہ ہونے کی دلیل ہے اسے کیونکر "شرک"۔۔۔۔ کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ کفر و شرک کے ان الزامات سے دور رہ کر جو وہابیوں کی کتب میں بھرے پڑے ہیں مذکورہ مسئلہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے پرکھا جائے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہابیوں سے تعلق رکھنے والے وہ علماء جنہوں نے میانہ روی کو اہمیت دی ہے انہوں نے خدا کو اولیائے کرام کی قسم دینے کے موضوع کو مکروہ قرار دیا ہے یعنی ان علماء نے صنعانی کے برعکس جو کہ شدت پسند ہے جس نے مذکورہ مسئلے کو کفر و شرک سے تعبیر کیا ہے اس مسئلے کے بارے میں کفر و شرک کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔

اب جبکہ ہماری بحث کے بارے میں اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس موضوع کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ آیا وہ حرام اور مکروہ ہے یا نہیں؟ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ضمن میں ایسے دلائل پیش کریں جو اس قسم کے توسل کے جواز کو ثابت کرسکیں۔

اسلام میں اس قسم کے توسل کا وجود

اسلامی روایات میں اس قسم کے توسل کا بکثرت ذکر موجود ہے اور یہ مستند اسلامی روایات جو جناب رسولِ اکرم (ص) اور ائمہ طاہرین (ع) کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں ان کی موجودگی میں اس قسم کے توسل کو نہ تو حرام کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی مکروہ۔

جناب رسولِ اکرم (ص) کا نابینا شخص کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین کرنا کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ۔

(سنن ابن ماجہ - ج - ۱ - ص ۴۴۱)

ابو سعید خدری - کا رسولِ اکرم (ص) سے اس دعا کا نقل کرنا کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْکَ وَاَسْئَلُکَ بِحَقِّ مَمْشَایَ ھٰذَا۔۔۔۔۔

(صحیح ابن ماجہ ج ۱، ص ۲۶۲، مسند احمد ج ۳، حدیث ۲۱)

حضرت آدم کا اس انداز سے توبہ کرنا کہ:

اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا غَفَرْتَ لِیْ

جناب رسولِ خدا (ص) کا حضرت علی (ع) کی والدہ کو دفن کرتے وقت یہ کہنا کہ :

اَغْفِرْ لِاُمِّیْ فَاطِمَةَ بِنْتِ اَسَدٍ وَ وَسِّعْ عَلَیْهَا مَدْخَلَهَا بِحَقِّ
نَبِیِّكَ وَالْاَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِیْ

یہ وہ عبارتیں ہیں جن میں اگرچہ ظاہراً کوئی ایسا لفظ دکھائی نہیں دیتا جس کی وجہ سے اسے قسم کہا جائے تاہم ان جملوں کے حقیقی معنی خدا کو اولیاء کے صدقے کی قسم دینے ہی کے ہیں اس کے علاوہ وہ ادعیہ جو صحیفہ سجادیہ میں چوتھے امام (ع) کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں وہ بھی اس توسل کے جواز کا مکمل اور واضح ثبوت ہیں اس لئے کہ صحیفہ سجادیہ کی دعاؤں کا مفہوم کلمات کی فصاحت اور ان کی معنوی بلاغت ہمیں اس شک سے بے نیاز کر دیتی ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ مذکورہ صحیفہ کا تعلق امام (ع) سے نہیں ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام ماہ ذی الحجہ کی نو تاریخ کو خدا کے حضور اس انداز سے راز و نیاز فرماتے ہیں کہ :

بِحَقِّ مَنِ انْتَجَبْتَ مِنْ خَلْقِكَ وَبِمَنِ اصْطَفَیْتَهٗ لِنَفْسِكَ وَبِحَقِّ
مَنِ اخْتَرْتَ مِنْ بَرِیَّتِكَ وَمَنِ اجْتَبَیْتَ لِشَاْنِكَ بِحَقِّ مَنْ وَصَلْتَ
طَاعَتَهٗ بِطَاعَتِكَ وَمَنْ نُطْتَ مُعَادَاتَهٗ بِمُعَادَاتِكَ

(صحیفہ سجادیہ - دعا - ۴۷)

ترجمہ :

اے خدا ان تمام لوگوں کے صدقے میں جن کو تو نے اپنی تمام مخلوق میں سے انتخاب کیا ہے اور اپنے لئے انتخاب کیا ہے، ان تمام لوگوں کے صدقے میں جن کو تُو نے لوگوں میں صاحب اختیار بنایا ہے اور ان کو خود اپنے سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے پیدا کیا، ان پاک لوگوں کے صدقے میں جن کی اطاعت کرنے کو اپنی اطاعت اور جن سے دشمنی رکھنے کو خود اپنے سے دشمنی رکھنے کے برابر سمجھا ہے۔

امام نے جب اپنے جدِ امجد حضرت علیؑ امیر مومنان ؑ کی قبر کی زیارت کی تو اس کے آخر میں یہ دعا پڑھی۔

اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ دُعَآئِیْ وَاقْبَلْ ثَنَآئِیْ وَاجْمَعْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اَوْلِیَآئِیْ
بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِیٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ .....

(زیارت امین اللہ)

ترجمہ :

بار الہا! میری دعا اور عبادت کو قبول فرما۔ اور حضرت محمد (ص) حضرت علی، حضرت فاطمہ حضرت حسن ؑ اور حضرت امام حسین ؑ کے صدقے میں مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر۔

یہ صرف حضرت امام زین العابدین اور امام جعفر صادق (ع) ہی نہیں ہیں جو اپنی ادعیہ میں خدا کو اس کے مقرب بندوں کی قسم دیتے ہیں بلکہ تمام آئمہ طاہرین (ع) کی دعاؤں میں اس قسم کے توسل کا وجود نظر آتا ہے۔

جناب سید الشہداء حضرت امام حسین بن علی علیہما السلام ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِكَلِمَاتِكَ وَمَعَاقِدِ عِزِّكَ وَسُكَّانِ سَمٰوٰتِكَ
وَاَرْضِكَ وَاَنْبِیَائِكَ وَرُسُلِكَ اَنْ تَسْتَجِیْبَ لِیْ فَقَدْ رَهِقَنِیْ
مِنْ اَمْرِیْ عُسْرٌ فَاَسْئَلُكَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ
وَاَنْ تَجْعَلَ مِنْ اَمْرِیْ یُسْرًا۔

اے خدا میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ اپنے کلام پاک، مقدس مراکز، زمین و آسمان کے ساکنین، انبیاء اور اپنے اولیاء کے طفیل میری دعا کو قبول فرما کیونکہ میں مشکلات میں ہوں، تجھ سے چاہتا ہوں کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود اور رحمت نازل فرما اور میرے کام کو آسان کر۔

اس قسم کی دعاؤں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کو یہاں بیان کرنا مشکل ہے۔ لہذا ہم اپنی بحث کو مختصر کرتے ہوئے وہابیوں کے دلائل و اعتراضات کے جوابات کی طرف آتے ہیں۔

وہابیوں کے اعتراضات

۱۔ پہلا اعتراض

علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ خدا کو اس کی مخلوق یا مخلوق کے واسطے کی قسم دینا حرام ہے

(کشف الارتیاب ۔ ص ۔ ٣٢٠ منقول از الہدیہ السنیہ)

اجماع کے معنی یہ نہیں ہیں کہ علمائے اسلام کسی زمانے یا ہر زمانے میں احکام سے کسی حکم کے بارے میں متفق ہو جائیں۔ اس صورت میں اہل سنت کے علماء کے نظریہ کے مطابق یہ اتفاق نظر خود ایک حجت الٰہی ہے اور شیعہ علماء کے نظریہ کے مطابق یہ عمل اس وجہ سے حجت ہے کہ امام معصوم کی تائید و موافقت کو بیان کرتا ہے جو کہ اُمت کے درمیان موجود ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس مسئلہ کے بارے میں اس قسم کا اتفاق موجود ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے ہم شیعہ اور دوسرے سنی علماء کے نظریات کو الگ رکھتے ہیں اور صرف اہل سنت کے چار اماموں کے نظریات کو ثبوت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیا اہل سنت کے ان چار اماموں نے اس قسم کے توسل کے حرام ہونے کا کوئی فتویٰ دیا ہے؟ اگر اس قسم کا کوئی فتویٰ موجود ہے تو مہربانی فرما کر فتوے کی پوری عبارت کتاب کا نام اور صفحے وغیرہ کو بیان کریں۔

اصولی طور پر اہل سنت کی فقہ و حدیث وغیرہ کی کتابوں میں اس قسم کے توسل کا کوئی ذکر نہیں ہے تاکہ ان کے بارے میں اظہار نظر کر سکیں۔ اس لئے وہ اجماع اور اتفاق نظر جس کا دعویدار الہدیہ السنیہ میں ہے کہاں اور کس کتاب میں موجود ہے؟ وہ صرف ایک شخص "العز بن عبد السلام" کے حوالے سے جو کہ بالکل غیر معروف ہے حرام ہونے کے اس فتوے کو بیان کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیائے اسلام میں صرف الہدیہ السنیہ کا مؤلف اور "العز بن عبد السلام" ہی اسلامی علماء ہیں۔

اس کے بعد "ابو حنیفہ" اور ان کے شاگرد "ابو یوسف" کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ ان دونوں نے بھی کہا کہ "فلاں فلاں کے صدقے یا طفیل سے دعا کرنا حرام ہے۔"

مختصر یہ کہ اس مسئلہ میں اجماع نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ رسول اکرم (ص) اور آپ کے اہل بیت کی ان مستند روایات کے مقابلے میں

جو کہ ثقل اصغر اور حجت کے طور پر اہل سنت کے محدثین کی جانب سے بیان کی گئی ہیں۔ ان دو افراد کے اقوال کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ جبکہ یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ "ابو حنیفہ" نے یہ فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟

۲۔ دوسرا اعتراض

إِنَّ الْمَسْأَلَةَ بِحَقِّ الْمَخْلُوقِ لَا تَجُوزُ لِأَنَّهُ لَا حَقَّ لِلْمَخْلُوقِ عَلَى الْخَالِقِ۔

(کشف الارتیاب ۔ ص ٣٣١ ۔ نقل از قدوری)

مخلوق کے صدقے سے خدا سے سوال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ خالق کے ذمے مخلوق کا کوئی حق نہیں ہے۔

جواب: اگرچہ اس قسم کی دلیل تراشی، قرآن کی واضح آیات کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تاہم اگر مخلوق کا خالق جہاں پر کوئی حق نہیں ہے تو پھر جیسا کہ اس سے قبل احادیث میں بیان کیا گیا ہے حضرت آدم اور رسول اسلام (ص) کیوں خدا کو اس قسم کے حقوق کی قسمیں دیا کرتے اور ان ہی حقوق کی بنا پر خدا سے سوال کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خدا کو قسم دیتے وقت ضروری نہیں کہ لفظ "علیک" کا استعمال کیا جائے بلکہ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ "اللّٰھم انی اسئلک بحق فلاں و فلاں" کہیں اور لفظ "حق" عربی زبان میں "امر ثابت" کے معنی میں ہے اور اس حق سے مراد وہ مقام ہے جو نیک بندوں کو اللہ کی بارگاہ میں حاصل ہے۔ مثال کے طور پر قرب، زہد تقویٰ، عبادت، علم وغیرہ ہیں۔ یہ وہ مقام و عظمت ہے جس کا وجود ضروری نہیں ہے کہ کسی کے لئے نقصان کا باعث ہو۔

اگر ہم مذکورہ امور سے چشم پوشی کر لیں تب بھی سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا قول (اعتراض) کو تسلیم کر لیں تو پھر قرآن مجید کی ان آیات کے بارے میں کیا کہیں گے جن میں بندوں کا اپنے خالق پر حق بتایا گیا ہے؟ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن حکیم نے اپنے نیک اور صالح بندوں کو خدا پر حق رکھنے والوں کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے نیز احادیث میں بھی اس امر کی تائید موجود ہے کہ مخلوق کا بھی اپنے خالق پر حق ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات کریم سے ثابت ہے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (دوم ٤٧)

اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (سورۂ توبہ ١١١)

اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ توراۃ اور انجیل میں ہے۔

كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(سورہ یونس - ۱۰۳)

ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچالیں (ان کی حفاظت کریں)

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ

(سورۃ النساء - ۱۷)

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں۔

لہٰذا قابلِ غور و فکر ہے یہ امر کہ آخر بے بنیاد تصورات اور عقائد کو پیشِ نظر رکھ کر آیا ان آیاتِ کریمہ کی غلط تاویل پیش کرنا درست ہے؟

اس کے علاوہ درجِ ذیل احادیث بھی قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُ مَنْ نَكَحَ الْتِمَاسَ الْعِفَافِ عَمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ۔

یعنی اس شخص کی مدد کرنا خدا کا کام (حق) ہے جو برائیوں سے اپنا دامن بچانے کے لیے شادی کرے۔

(الجامع الصغیر سیوطی - ج - ۲ - ص ۳۳)

۲۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمُ الْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اَلْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْاَدَاءَ وَالنَّاكِحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ التَّعَفُّفَ۔

(سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۴۱)

تین قسم کے لوگوں پر خدا کی امداد لازم ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے پر، وہ غلام جس نے اپنے مالک سے یہ طے کیا ہے کہ ایک معینہ رقم کی ادائیگی کے بعد اس کو آزاد کرے اور وہ جوان جو شادی کے ذریعے اپنی پاک دامنی کی حفاظت کرنا چاہتا ہو۔

اَتَدْرِيْ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ؟

کیا تو اس حق کو نہیں دیکھتا جو پروردگار پر اس کے بندوں کا ہے؟

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر خدا پر کوئی حق نہیں رکھتا خواہ وہ صدیوں

خدا کی پرستش و عبادت ہی کیوں نہ کرے اور اس کے سامنے سربسجود ہو کیونکہ بندوں کے پاس جو کچھ بھی ہے خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔

اس بنا پر اس حق سے مراد وہ انعامات اور مقام و عظمت ہے جو خدا وند عز و جل اپنی عنایتِ خاص کی وجہ سے اپنے نیک بندوں کو عطا کرتا ہے اور اس مقام و عظمت یا انعامات کی عطا کو اپنے ذمہ لے لینا بھی درحقیقت خدائے بزرگ و برتر کی عظمت کی ایک نشانی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہنا قطعی درست ہوگا کہ مخلوق کا اگر اپنے خالق کے ذمے کوئی حق ہے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک فقیر اور نادار بندے سے خدا نے قرض لیا ہو۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً۔

(سورہ بقرہ - آیت ۲۴۵)

اللہ کا یہ وعدہ اور بندے کا اپنے خالق سے حق حاصل کرنے والا بن جانا درحقیقت لطف و کرمِ خداوندی ہے یہ خدائے عز و جل کا کمالِ لطف اور احسان ہے اپنے بندے پر کہ اس نے خود کو اپنے بندے کا مقروض قرار دیا، بندوں کو صاحبِ حق اور خود کو مَنْ عَلَيْهِ الْحَق یعنی مقروض حق سے تعبیر کیا ہے۔

○

باب ۱۵

غیرِ خدا کی قسم اور وهابی عقیدہ

"وہابی" غیرِ خدا کی قسم کے بارے میں خاص قسم کا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ "وہابی" مصنف "صنعانی" نے اپنی کتاب "تطہیر الاعتقاد" میں غیرِ خدا کی قسم کو "شرک" قرار دیا ہے جبکہ الہدایۃ السنیۃ کے مؤلف نے اس عمل کو "شرکِ اصغر" سے تعبیر کیا ہے۔

(دیکھئے کشف الارتیاب۔ ص ۳۳۶۔ تطہیر الاعتقاد ص ۱۲۔ اس کتاب کے مؤلف نے اس مسئلہ کو الہدیۃ السنیۃ کے صفحہ ۲۵ سے نقل کیا ہے)

غیرِ خدا کی قسم کے جواز میں ہمارا استدلال

پہلی دلیل

قرآن مجید نہ صرف ہر مسلمان کے لئے "ثقل اکبر" اور "رہبر اعلیٰ" کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ وہ ہر مسلمان کے لئے بہترین آئینِ زندگی بھی ہے اس مقدس کتاب میں متعدد مقامات پر غیر خدا کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اگر ہم ان تمام مقامات کو بیان کرنا چاہیں تو ہماری بحث بیحد طولانی ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم صرف چند مقامات کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے صرف "سورہ الشمس" میں اپنی مخلوقات میں سے مندرجہ ذیل سات چیزوں کی قسم کھائی ہے۔

سورج۔ اس کا نور۔ ماہتاب۔ رات۔ آسمان۔ نفسِ انسانی اور زمین۔

اسی طرح سورۂ "النازعات" میں تین چیزوں کی۔ سورۂ المرسلات میں دو چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں مزید برآں۔ سورۂ بروج۔ الطارق۔ القلم، العصر اور البلاد میں بھی خدا نے مختلف اشیا کی قسمیں کھائی ہیں۔

ان قسموں کی چند مثالیں درج ذیل آیات میں ملاحظہ فرمایئے۔

- وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ

قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا کی اور اس شہر کی جو جائے پناہ ہے۔

- وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى

اور قسم دن کی جب اسے چمکا دے اور رات کی جب اسے ڈھانک لے

- وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ

صبح کی قسم، اور دس راتوں کی۔ اور جفت و طاق اور رات کی جب آنے لگے

• وَالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ۔

قسم ہے طور کی اور اس کتاب کی جو کشادہ اوراق میں لکھی ہوئی ہے اور بیت معمور کی (جو کعبہ کے سامنے فرشتوں کا قبلہ ہے) اور اونچی چھت (آسمان) کی اور جوش و خروش والے سمندر کی۔

• لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ

(اے رسول) تیری جان کی قسم یہ لوگ (قوم لوط) اپنی مستی میں مدہوش ہو رہے تھے

یہاں مسلسل قسموں کے بیان کے بعد جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر خدا کی قسم کھانا شرک اور حرام ہے؟

قرآن مجید ہدایات کا بہترین نمونہ ہے اگر اس میں ذکر شدہ باتوں پر عمل کرنا حرام تھا تو ضروری تھا کہ اس بات کی تاکید کی جاتی کہ اس قسم کی قسمیں کھانے کا حق صرف خدا کو ہے کچھ بے ذوق لوگ جن کو مقاصد قرآنی کی اطلاع نہیں ہے جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے جو باتیں خدا کے لئے مناسب ہوں وہی باتیں اس کے علاوہ کسی اور کے لئے مناسب نہ ہوں۔

لیکن مذکورہ نظریئے کا جواب واضح ہے کیونکہ اگر حقیقت میں غیر خدا کی قسم کھانا "شرک" اور غیر خدا کو خدا سے تشبیہ دینا ہے تو پھر کیوں خود خدا اعلی الاطلاق اور شرک صغیر کا مرتکب ہو گیا ہے کیا یہ صحیح ہے کہ خدا عملی طور پر اپنے لئے کسی شریک کا قائل ہو جائے اور اپنے علاوہ کسی اور کو شریک بنانے سے روکے؟

دوسری دلیل

خود رسول اکرم (ص) نے بھی غیر خدا کی قسم کھائی ہے۔ ذیل میں اس سلسلے میں کچھ احادیث بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم سے ایک حدیث۔

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ (ص) فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَيُّ الصَّدَقَةِ اَعْظَمُ اَجْرًا؟ فَقَالَ اَمَا وَاَبِيْكَ لَتُنَبَّاَنَّهُ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَاْمُلُ الْبَقَاءَ

(صحیح مسلم۔ کتاب الزکاۃ۔ جزو ۳۔ باب افضل الصدقہ۔ ص ۹۴)

ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا۔۔۔۔ رسول خدا کونسے صدقے کا انعام زیادہ ہے؟ آپ نے فرمایا تیرے باپ کی قسم تجھے بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں صدقہ کرنا جبکہ خود سالم ہو اور صدقہ دینے والی چیز کو عزیز رکھتے ہو لیکن فقر سے ڈرتے اور مستقبل کی زندگی کی فکر میں ہو۔

۲۔ صحیح مسلم سے ایک اور حدیث

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى رَسُوْلِ اللهِ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ يَسْاَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ص) خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ؟ قَالَ لَا، اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ۔ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ؟ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ۔ وَذَكَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ (ص) اَلزَّكَاةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ۔ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللهِ لَا اَزِيْدُ عَلَى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ اَفْلَحَ وَاَبِيْهِ اِنْ صَدَقَ اَوْ اَدْخَلَ الْجَنَّةَ وَاَبِيْهِ اِنْ صَدَقَ۔

(صحیح مسلم۔ جزو اول باب ما ہو الاسلام و بیان خصالہ۔ ص ۳۲)

ترجمہ

نجد کا رہنے والا ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں آیا اور اسلام کے بارے میں سوال کیا

آنحضورؐ نے فرمایا کہ مندرجہ ذیل باتیں اسلام کی بنیاد ہیں۔

الف :۔ شب و روز میں پانچ مرتبہ نماز۔ نجدی نے پوچھا کیا اس کے علاوہ بھی نمازیں ہیں۔ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں مستحب نمازیں ہیں۔

ب :۔ رمضان کے روزے۔ اس شخص نے پوچھا، کیا اس کے علاوہ بھی روزے ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مستحب روزے۔

ج :۔ زکوٰۃ۔ اس شخص نے پوچھا کوئی اور زکوٰۃ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں مستحب طور پر وہ شخص آنحضورؐ کی خدمت سے رخصت ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا نہ کم کروں گا اور نہ زیادہ آنحضورؐ نے فرمایا اس کے باپ کی قسم نجات پا گیا۔ اگر سچ کہہ رہا ہے تو اس کے باپ کی قسم جنت میں جائے گا۔

فَلَعَمْرِیْ لَاَنْ تَکَلَّمَ بِمَعْرُوْفٍ وَتَنْھٰی عَنْ مُنْکَرٍ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَسْکُتَ

(مسند احمد حنبل ۔ ج ۔ ۵ ۔ ص ۲۲۵)

ترجمہ

جان عزیز کی قسم اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بولو تو تمہارا یہ بولنا تمہارے خاموش رہنے سے کہیں بہتر اور افضل ہے

○

اہلِ سُنّت کے چہارگانہ مذاہب اور غیر خدا کی قسم

وہابیوں کے دلائل پر بحث سے قبل ضروری ہے کہ اہلِ سنت کے چہارگانہ مذاہب کے ائمہ نے "غیر خدا کی قسم" کے مسئلے کے بارے میں جو فتاوٰی دیئے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ "حنفی" معتقد ہیں کہ تیرے باپ یا تیری زندگی وغیرہ جیسی قسمیں کھانا مکروہ ہیں۔ جب کہ "شافعی" یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ غیر خدا کی قسم صرف اس صورت میں جب کہ سچی نہ ہو مکروہ ہے۔

"مالکی" کہتے ہیں کہ بزرگانِ دین اور دیگر دینی مقدسات جیسے رسول خدا، خانہ کعبہ اور قرآن مجید ... ہیں ایک نظریئے کے مطابق ان کی قسم کھانا مکروہ ہے جب کہ دوسرے نظریئے کے مطابق حرام ہے۔ ہاں البتہ بزرگان دین اور دینی مقدسات کا احترام ضروری ہے "حنبلی" یہ عقیدہ رکھتے ہیں، خداوندِ عالم اور اس کی صفات کی قسموں کے علاوہ دیگر تمام قسمیں خواہ وہ قسم رسول خدا یا ان کے کسی ولی ہی کی کیوں نہ ہو حرام ہیں۔

(دیکھئے الفقہ علی مذاہب الاربعہ ۔ کتاب الیمین ۔ ج ۱ ۔ ص ۷۵)

کیونکہ مندرجہ بالا تمام فتاوی قرآن مجید کی آیات، سنتِ رسولؐ اور اولیائے کرام سے متعلق خصوصی مقابلے میں ایک قسم کا اجتہاد ہیں اور اہلسنت میں کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے لہذا عصر حاضر کے اہلسنت کے پاس سوائے اس کے کوئی راہ نہیں کہ وہ ان چار اماموں میں سے کسی ایک کی پیروی کریں پھر ان تمام باتوں کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ اگر ہم اس بات کو بھی نظر انداز کر دیں کہ "قسطلانی" نے "ارشاد الساری" میں مالکیہ کے حوالے سے اس کی کراہیت کو بیان کیا ہے پھر بادجو اس کے یہ بات واضح اور مسلم نہیں ہے کہ حنبلی گروہ نے اس قسم کی قسم کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی جس کو اس نے فقہ حنبلی کے احیاء اور فروغ کے لئے مُنتق کر رکھا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ:

ہمارے بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ جناب رسول خداؐ کی قسم کھانا ایسی قسم ہے جس کو توڑنے پر کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے پھر موصوف نے احمد کے حوالے سے بتایا ہے کہ جو شخص رسول خدا (ص) کی قسم کھائے اور اسے توڑ دے تو ایسی صورت میں کفارہ ادا کرنا چاہیئے اس لئے جناب رسول اکرم (ص) کا حق ادا کرنا شہادت کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے۔ تب بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل سنت کے بارہ اماموں میں سے کسی نے بھی اس قسم کی قسم کو قطعی طور پر حرام قرار نہیں دیا۔

بہرحال اہل سنت کے چاروں ائمہ کے نظریات کو جاننے کے بعد اب ہم ذیل میں ان احادیث کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنکو بہانہ قرار دیکر وہابیوں نے ناحق بے گناہوں کا خون بہایا۔ (وہابیوں نے ۱۲۱۶ ہجری میں پھر ۱۲۵۹ھ میں کربلائے معلی پر حملہ کیا تھا اور وہاں بسنے والے چھوٹے بڑے کا قتل عام کیا اور کسی پر رحم نہیں کھایا بلکہ بتایا جاتا ہے کہ تین دن کے اندر وہابیوں نے چھ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور امام حسین علیہ السلام کے روضۂ مبارک کی تمام چیزوں کو یزید کی فوج کی طرح لوٹا بھی تھا کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ یہ لوگ اولادِ رسول (ص) کی قسمیں کھایا کرتے تھے)

وہابیوں کی احادیث!

پہلی حدیث!

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ سَمِعَ عُمَرَ (رض) وَھُوَ یَقُوْلُ: وَ اَبِیْ فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ یَنْھَاکُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَآئِکُمْ، وَمَنْ کَانَ حَالِفاً فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ

ترجمہ! جناب رسول اکرم (ص) نے سنا کہ حضرت عمر (رض) اپنے باپ کی قسم کھاتے ہیں چنانچہ آنحضور (ص) نے فرمایا! خدا نے تم کو اپنے باپ کی جان کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے اگر تم میں سے کوئی قسم کھانا چاہے تو صرف اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے

ہمارا جواب!

۱۔ باپ کی جان کی قسم کھانے سے منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے باپ مشرک اور بت پرست تھے۔ اور اس قسم کے افراد کی کوئی قدر و قیمت یا احترام نہیں ہے لہذا ایسے افراد کی قسم کھانا بے معنی ہے پھر بعض احادیث میں تاکید کی گئی ہے کہ والدین اور طاغوت (عربوں کے بتوں) کی قسم نہ کھاؤ۔

(دیکھئے السنن الکبری ج۔ ۱ ص۔ ۲۹ منقول از صحیح مسلم، سنن نسائی۔ ج۔ ۷ ص۔ ۷، سنن ابن ماجہ ج۔ ۱ ص ۲۷۸) جب کہ ایک اور حدیث میں تاکید کی گئی ہے کہ

وَلَا تَحْلِفُوْا بِآبَآئِکُمْ وَلَا بِاُمَّھَاتِکُمْ وَلَا بِالْاَنْدَادِ

(سنن نسائی ج۔ ۷۔ ص ۶)

۲۔ باپ کی قسم کھانے سے منع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قسم وہاں کھائی جاتی ہے جہاں مقصد انصاف برقرار کرنا اور دشمنی ختم کرانا ہو کیونکہ دشمنی ختم کرنے کے لئے علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ اس مقصد کے لئے خدا اور اس کی صفات کی قسم کے علاوہ اور کوئی قسم کافی نہیں ہے لہذا باپ کی قسم کھانے سے منع کیا گیا

اگر مذکورہ بالا قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب رسول اکرم (ص) نے اولیائے خدا اور دیگر مقدسات کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے؟ اس لئے کہ یہ قرائن اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ ممانعت خاص وجوہات کی بناء پر ہے۔

دوسری حدیث!

جَاءَ اِلَی ابْنِ عُمَرَ رَجُلٌ فَقَالَ: اَحْلِفُ بِالْکَعْبَةِ، قَالَ لَا وَلٰکِنْ اَحْلِفُ بِرَبِّ الْکَعْبَةِ، فَاِنَّ عُمَرَ کَانَ یَحْلِفُ بِاَبِیْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: لَا تَحْلِفْ بِاَبِیْكَ فَاِنَّ مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ

(السنن الکبریٰ ج ۱۰ ص ۲۹ - مسند احمد ج ۱ ص ۴۷)

ترجمہ!

حضرت عمر کے بیٹے کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا میں کعبہ کی قسم کھاتا ہوں حضرت عمر کے بیٹے نے کہا رب کعبہ کی قسم کھاؤ اس لیے کہ حضرت عمر اپنے باپ کی قسم کھایا کرتے تھے پس رسول اللہ (ص) نے حضرت عمر سے کہا کہ اپنے باپ کی قسم مت کھاؤ بتحقیق جس نے اللہ کے غیر کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

ہمارا جواب!

مذکورہ حدیث کے مفہوم میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں

۱۔ آنے والا حضرت عمر (رض) کے بیٹے کے پاس دشمنی ختم کرنے کی غرض سے آیا تھا اسی لئے اس نے تقاضا کیا تھا کہ خانہ کعبہ کی قسم کھائی جائے اور ہم گذشتہ حدیث کے ضمن میں بتا چکے ہیں کہ دشمنی ختم کرنے کے موقع پر سوائے خدا کے کسی کی قسم معتبر نہیں نیز ہمارا موضوع احترام کے تحت کھائی جانے والی قسمیں ہیں۔

۲۔ کیونکہ عرب قبول اسلام کے بعد بھی زمانہ جاہلیت کی رسوم کے مطابق "لات" اور عزیٰ (مشرکین کے بتوں) کی قسمیں کھاتے تھے لہذا اس ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنے اعمال کو جاہلیت کے دور کی رسومات سے دور رکھیں۔

مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلْفِهٖ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی، فَلْیَقُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

(سنن نسائی ج ۷ ص ۸)

ترجمہ!

تم میں سے جو بھی "لات" اور عزیٰ کی قسم کھائے گا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ (توبہ اور کفارے کے طور پر) "لا اله الا اللہ" کہے۔

لہذا اگر رسول اکرم (ص) نے فرمایا ہے کہ

فَاِنَّ مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ.

تو اس کی وجہ یہی لات اور عزیٰ نامی بتوں کی قسمیں ہیں یہ دوسری بات ہے کہ عبداللہ بن عمر نے جناب رسول اکرم (ص) کے اس مستقل کلام کو اپنے ذوق کے مطابق باپ کی قسم کے مشابہ قرار دے کر دونوں کو یکجا بیان کر دیا حالانکہ جناب رسول اکرم (ص) نے یہ دو جملے (یعنی لَا تَحْلِفْ بِاَبِیْكَ اور مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰهِ فَقَدْ) ایک مقام پر ادا نہیں کئے۔

○

بالغرض اگر یہ مان لیا جائے کہ دونوں جملے ایک ہی موقع پر آنحضور صلعم نے ادا فرمائے تھے تو اس صورت میں کیونکہ یہ مسلم امر ہے کہ موحد اور مسلمان باپ کی قسم میں کسی طرح بھی شرک کا شائبہ نہیں ہوتا ہے اس لئے ناممکن ہے کہ اسے "شرک" سے تعبیر کیا جائے یہ درست ہے کہ مشرک والدین کی قسم ان کی تعظیم اور احترام کی وجہ سے کیونکہ شرک آمیز عقائد کے احترام کی جھلک پائی جاتی ہے اس لئے ان کی ممانعت کی گئی ہے بہرحال مذکورہ دلائل سے واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ حدیث کا قرآن، رسول اکرم، ائمہ طاہرین، خانہ کعبہ اور دیگر مقدسات سے کوئی تعلق نہیں

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

○

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اھلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

Hassan

naqviz@live.com

﴾التماس سورۃ الفاتحہ﴿

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان